ندائے سحر



ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں رح

نداے سحر

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

نام کتاب	:	ندائے سحر
مؤلف	:	غلام مصطفیٰ خاں
تعداد	:	گیارہ سو
اشاعت	:	ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ/ جنوری ۲۰۰۶ء
صفحات	:	۲۷۲
قیمت	:	۱۲۰ روپے

ملنے کے پتے

دارالاشاعت	اردو بازار، کراچی
فضلی بک سپر مارکیٹ	اردو بازار، کراچی، فون: ۲۲۱۲۹۹۱
مکتبہ انعامیہ	اردو بازار، کراچی فون: ۲۲۱۶۸۱۴
اسلامی کتب خانہ،	نیوٹاؤن، کراچی، فون ۴۹۲۷۱۵۹
بیت الکتب:	گلشن اقبال ۲، مدرسہ اشرف المدارس، کراچی
کتاب سرائے	فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۳۲۰۳۱۸
مکتبہ رحمانیہ	غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور
ادارۂ اسلامیات	۱۹۰، انارکلی۔ لاہور، فون: ۷۲۴۳۹۹۱، ۷۳۵۳۲۵۵
مکتبہ فیض القرآن	قاسم سینٹر، اردو بازار، کراچی، ۲۲۱۷۷۷۶
مکتبہ القادر	نزد جامعہ خیر العلوم، خیر پور ٹامیوالی۔ بھاولپور

ناشر

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی۔ فون: ۶۶۸۴۷۹۰

www.zawwaracademy.org

E-mail:info@zawwaracademy.org

فہرستِ عنوانات

عرضِ ناشر ۵

پیشِ گفتار ۷

بے لوث خدمت ۹

قرآنِ پاک اور صوتیات ۱۳

فرائض کی اہمیت ۱۸

سخت کوشی ۲۲

تسلیم ورضا ۲۸

فضول خرچی ۳۳

اتحادِ ملت ۳۷

نماز کے معاشرتی فوائد ۴۲

دعا کی حقیقت اور اہمیت ۴۸

اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام ۵۴

اصحابِ رسول کا ذکر قرآن میں ۵۹

اختلافات دور کرنے کے طریقے ۶۵

دعوت اور تبلیغ کے اصول ۶۹

اسلامی زندگی کی برکات ۷۵

احترامِ انسانیت ۸۰

صراطِ مستقیم ۸۶

تحمل اور بردباری ۹۳

بہتان باندھنا ۱۰۰

ایمان ۱۰۵

فرض شناسی ۱۱۰

فراخ دلی ۱۱۶

رسول کریم ۔ قرآنِ حکیم کی نظر میں ۱۲۱

رسولِ کریم ۔ عنفوانِ شباب ۱۲۷

اتباعِ رسول ۱۲۹

خشیتِ الٰہی ۱۳۴

اللہ پر بھروسا ۱۳۸

جواب دہی کا تصور ۱۴۳

اللہ کے لئے جینا اور مرنا ۱۴۸

تحصیلِ علم ۱۵۲

علمِ اشیا ۱۵۷

پاکیزگیٔ خیال ۱۶۱

مساوات ۱۶۶

فرد اور معاشرہ ۱۷۲

تکمیلِ دین کا مفہوم ۱۷۷

ایفائے عہد	۱۸۳
بدگمانی	۱۸۸
عیب پوشی	۱۹۳
صلح صفائی	۱۹۸
جرأت وہمت	۲۰۴
فتنہ وفساد	۲۱۰
شُکرِ نعمت	۲۱۵
بُخل ایمان کی کمزوری ہے	۲۲۰
عدل اور احسان	۲۲۵
پڑوسیوں کے حقوق	۲۳۰
خواتین کے حقوق	۲۳۵
حسنِ معاملہ	۲۴۰
تواضع	۲۴۵
بزرگوں کا احترام	۲۵۰
فتحِ مکہ	۲۵۵
احکامِ الٰہی سے غفلت کی سزا	۲۵۸
اسلام اور جدید علوم	۲۶۳
قرآنی تراجم وتفاسیر	۲۶۸

عرض ناشر

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں رحمہ اللہ کی خدمات مختلف شعبوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔آپ کا اصل شعبہ اگرچہ اردو زبان وادب تھا،لیکن آپ نے اسلامی اور مذہبی موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔اور بہت بڑا ذخیرہ اپنے پیچھے استفادے کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔

آپ کی مذہبی تحریروں میں آپ کی وہ تقاریر بھی شامل ہیں، جو ایک طویل عرصے تک ریڈیو سے نشر ہو کر عوام وخواص کی راہنمائی اور تعمیر شخصیت کا سبب بنتی رہی ہیں۔آپ کی یہ تقاریر ندائے سحر کے نام سے متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔لیکن اب چونکہ عرصے سے یہ کتاب نایاب تھی،اس لئے اب ادارے کو اس کی اشاعت کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مولف ، ناشر اور قارئین کے لئے مفید اور ذخیرہ آخرت بنائے۔آمین

ناظم ادارہ

فاضل گرامی، برادر روحانی

حضرت مولانا ڈاکٹر ابوالفتح محمد صغیر الدین صاحب مدّ مجدہٗ

سابق شعبۂ اسلامیات و شعبۂ تقابلِ ادیان، سندھ یونیورسٹی

کی خدمت میں

جن کے احسانات فراموش نہیں کئے جا سکتے،

اور اللہ تعالیٰ ہی ان کو اجر دے سکتا ہے

احقر

غلام مصطفیٰ خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ گفتار

اللہ پاک کا بے انتہا شکر ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے قرآن جیسی بابرکت کتاب اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی جو ہدایت کا ذریعہ ہے، روشنی ہے، حق و باطل کا فیصلہ کرنے والی ہے، شفا ہے، ذکر ہے، نصیحت ہے، علم ہے اور سینکڑوں علوم کا سرچشمہ ہے۔ بندوں کو خدا سے ملانے کا ذریعہ ہے، جینے کے آداب سکھاتی ہے، مرنے کا طریقہ بتاتی ہے، اللہ کی رضا کے حصول کا راستہ دکھاتی ہے، دُنیوی و اُخروی سعادت اور فوز و فلاح کی ضامن ہے۔ غرض کیا کچھ نہیں ہے؟ سب کچھ ہے۔ لیکن ان کے لئے جو اس نعمتِ عظمیٰ کی قدردانی کریں، جن کے تمام اعمال کا مرکز و محور یہی ہو، جو اپنے ہر اقدام میں اسی کی طرف دیکھیں اور اسی کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کریں اور زندگی کے ہر شعبے میں اسی کو لائحۂ عمل بنائیں۔

زمانہ شاہد ہے کہ جنھوں نے اس کو سینے سے لگایا، اس کی روشنی میں اپنے عقائد کی اصلاح کی اور اس کی ہدایت کے مطابق اپنے اعمال و اطوار درست کئے تو دُنیوی اور اخروی کامیابی نے ان کے قدم چومے، کائنات اُن کی مسخر ہوگئی، اونٹوں کے چرانے والوں کو اُن کی آرزو کے بغیر اگر ایک طرف ''تختِ کیانی'' پیش کیا گیا تو دوسری طرف وہ ''وعدۂ فردا'' بھی لے کر گئے۔ لیکن جب لوگوں نے اس کی ناقدری کی، عملی میدان میں اس کو متروک و مجہور قرار

دے دیا تو سارا خسران اور ساری تباہی بصد ذلت و رسوائی ان کا مقدر بن کر رہ گئی اور آخرت کا علم تو خدا ہی کو ہے۔

پس اگر دنیوی و اخروی فلاح و کامیابی مقصود ہے تو اپنی زندگی کے ہر شعبے کو اسی کے مطابق ڈھالنا ہوگا، اور اسی سے روشنی حاصل کرنی ہوگی، ورنہ تاریکی ہی تاریکی اور رسوائی ہی رسوائی ہے۔ کیوں کہ قرآنِ حکیم کا ہماری زندگی سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ اس کے بغیر کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ریڈیو پاکستان صبح سویرے ہی ''قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی'' کے عنوان سے روزانہ ایک پروگرام نشر کرتا ہے۔ اس مفید اور معلوماتی پروگرام میں اور دیگر پروگراموں میں اس احقر کو حصہ لینے کی سعادت اکثر و بیشتر حاصل ہوتی رہتی ہے۔ بعض مخلص احباب نے اس طرف توجہ دلائی کہ ان تقریروں کو یکجا کر کے شائع کرا دیا جائے، تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ لیکن تمام تقریروں کے مسودات کی تلاش مشکل تھی۔ نیز یہ کہ اگر ان تمام تقریروں کو جمع کیا جاتا تو اس کی ضخامت بہت زیادہ ہو جاتی۔ لہٰذا مجبوراً صرف چند تقریروں پر اکتفا کرنا پڑا، جن کی نقول ریڈیو پاکستان سے یا خود اپنے پاس سے دستیاب ہو سکیں۔

غلام مصطفیٰ خاں

بے لوث خدمت

اللہ پاک نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے اپنے سارے نبیوں کو بے لوث خدمت پر مامور کیا اور ان کے لیے اجر صرف اپنے حد تک محدود رکھا۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے اس بے لوث اور بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا اور قوموں کے ہاتھوں ہمیشہ تکلیفیں اٹھائیں۔ سورہ۔ شعراء میں نوح علیہ السّلام کا واقعہ آتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ "میں، تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو سب جہانوں کے پروردگار ہی کے ذمہ ہے"۔

لوط علیہ السّلام اور شعیب علیہ السّلام کی قوموں نے جب ان کو جھٹلایا تو انھوں نے بھی یہی کیا تھا۔

ہمارے آقا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حق کی تبلیغ میں جو تکلیفیں اٹھائیں اور بنی نوع انسان نے جس طرح ان کے ساتھ برتاؤ کیا وہ قرآن و حدیث میں مفصل و مکمل موجود ہے۔

لطف تو یہ ہے کہ سیکڑوں سال پرانی باتیں پوچھ کر بھی لوگوں کو حضور انور صلّی علیہ وسلّم پر ایمان لاتے ہوئے تذبذب ہوتا تھا۔ سورہ۔ ہود میں نوح علیہ السلام کے واقعات اور سورہ۔ یوسف میں یوسف علیہ السلام کے حالات بالتفصیل مذکور ہیں وہ واقعات ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے، لیکن پھر بھی کفار نے دین کو قبول کرنے سے گریز کیا۔

شروع سے آخر تک انبیاء علیہم السلام نے دین جیسی بیش بہا نعمت بلا معاوضہ

اور بغیر کسی لالچ کے پیش کی، لیکن اکثر لوگوں نے ان کی بے لوث اور بے غرض خدمت کی قدر نہیں کی اور انھیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ کسی کو سنگسار کیا، کسی کو آرے سے چیر دیا، کسی کو لہولہان کیا، پتھر برسائے، سر پر اوجھ پھینکی، زخم پہنچائے، بائیکاٹ کیا اور قریبی عزیزوں تک نے قطع تعلق کر لیا۔ انبیاء علیہم السلام کی بے لوث خدمت نے دنیا کو یہ سبق دیا ہے کہ بہترین احسان اور بہترین نعمتوں کو پیش کرنے کا معاوضہ بھی دنیا کے لوگوں سے نہیں لینا چاہیے اور اس خدمت کا اجر صرف اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں ہوگا۔

ہمارے آقا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ نے یہاں تک فرما دیا کہ آپ یوں کہہ دیں کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے، جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ اس کے برابر کوئی نہیں ہے اور اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے مسلم ہوں۔

اس آیت میں ہر مسلمان کے لیے یہ پیام ہے کہ اس کا ہر فعل اور ہر عمل صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے اور جس شخص میں یہ صفت ہوگی اس سے کوئی برائی دانستہ نہیں ہوگی اور وہ شخص ایسا بے غرض ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے خرید نہ سکے گی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، جو قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے، بے غرض اور بے لوث خدمت ہی کی مترادف ہے۔ ان کی حیاتِ مبارکہ کا کون سا واقعہ ہے جو بے لوث نہ ہو اور کون سا فعل ہے جو بے غرض نہ ہو۔ ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے غلاموں کے اوصاف کے سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے کہ **ویو ثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصه ۞** " یعنی وہ دوسروں کی حاجت و ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں اپنے اوپر گو ان کو فاقہ ہو جائے۔" یہی چیز ایثار ہے، یعنی دوسرے کے فائدے اور آرام کو خود پر ترجیح دینا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ بھوک اور فاقہ کی حالت میں بھی وہ پہلے دوسروں کو سیری سے کھلاتے تھے

اور کچھ بچ رہتا تو خود نوش فرماتے ۔ سورہ۔ دہر کی آیت ہے: **ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا ٥** (اور کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین یتیم اور اسیر کو) ۔اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ کہتے ہیں: ہم تمھیں خاص اللہ کے لیے کھانا دیتے ہیں، تم سے کوئی بدلہ یا شکر گزاری نہیں مانگتے ۔

اللہ کے مخلص بندے ایسے لوگوں کو کھانا کھلا کر ان سے یہی کہتے ہیں کہ ہم تم کو محض اللہ کی رضاجوئی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں اور ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ زبان سے کوئی شکریہ ۔اس آیت کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کے اجر کا ذکر ہے کہ وہ ان مخلصین کو قیامت کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا۔

قرآن پاک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا بھی بے لوث خدمت کے لیے ہے ۔ایک مخلص اور سچے مسلمان کی پہچان اس طرح سورہ۔ والعصر میں پیش کی گئی ہے کہ " وہ آپس میں سچائی اور ثبات قدم کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں " ۔ سورہ۔ بلد میں ہے کہ " وہ آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں" ۔ یہ وہ تعلیم ہے جس میں خلوص ہی خلوص ہے اور اس خلوص کے لیے دنیا والوں سے کوئی اجر نہیں لیا جاتا، بلکہ اس کے برعکس یہ حکم بھی ہے کہ اپنے بھلائی کے کاموں کو احسان جتا کر یا بتلا کر ضائع نہ کرو ۔اس حکم سے ان تمام خرابیوں کا استیصال ہو جاتا ہے جس کی بنا پر انسانی نفس احسان کر کے اپنی بڑائی چاہتا ہے اور دوسروں پر اپنی فوقیت کا خواہاں ہوتا ہے ۔

ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو، یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمھارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور اگر نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو سورہ۔ نساء میں ہے "جو شخص کسی نیک کام کے لیے

سفارش کر دے تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا اور جو بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہی ہر چیز کا نگہبان ہے"۔ اسی کے ساتھ سورہ۔ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور ڈرو اللہ سے، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔" یہ اور اسی طرح کے جتنے اوامر اور نواہی ہیں وہ سب بے لوث خدمت اور اخلاص کے لیے ہیں اور اس خدمت کا کوئی صلہ دنیا والوں سے نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم سفارش کرو تو تمھیں بھی ثواب ملے گا۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔ یہ بھی فرمایا، بھولے بھٹکے ہوئے کو یا کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ جو شخص راستہ چلتے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو اللہ اس کے اس کام کی بھی قدر کرتا ہے۔

والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، زوجین کے حقوق، اہل قرابت، ہمسایہ، یتیم، بیوہ، ضرورت مند، بیمار، غلام، مہمان، مسلمان، عام انسان، حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے حقوق ادا کرنا کس لیے ہے؟ کیا ان حقوق کے ادا کرنے میں کوئی اجرت لی جاتی ہے اور کیا ان میں اخلاص نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام اس کے اوامر اور نواہی وغیرہ سب کی اساس بے لوث خدمت پر ہے اور ہم کو تمام اخلاق کے برتنے میں اخلاص ہی کی دعوت دی گئی ہے۔

قرآن پاک اور صوتیات

(تجوید و قرأت)

قرآن پاک جس طرح اپنی فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے دنیا میں بے مثل کتاب ہے، اسی طرح وہ اپنے بے شمار علوم کی وجہ سے بھی ایک صحیفہ ہے، جس کا کوئی مثیل و سہیم نہیں۔ ۱۷۔ رمضان المبارک کو غار حرا میں پہلی وحی اقراء کی نازل ہوئی اور ایسی ذاتِ گرامی پر نازل ہوئی جسے اللہ کے سوا کسی اور نے نہیں پڑھایا۔ لیکن اس نے پورے عالم کو پڑھایا اور اپنے قرآن کے ذریعے قریب تین سو نئے علوم دنیا کو عطا فرمائے ان ہی علوم میں صوتیات بھی شامل ہے، جس سے نہ صرف حروف کے مخارج و صفات کی شناخت ہوتی ہے بلکہ ان کے ادغام کی مختلف کیفیتوں کے سمجھنے سے ایک حرف کا دوسرے سے تبدیل ہو جانے کا ایک ایسا جامع و مانع علم حاصل ہوتا ہے کہ جدید صوتیات کے عالم اور لسانیات کے ماہر حضرات حیرت میں پڑجاتے ہیں۔ سورہ مزمل میں **ورتل القران ترتیلا** (اور قرآن پڑھ ترتیل کے ساتھ) کا حکم ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ترتیل کے معنی بتائے ہیں کہ (**ھو تجوید الحروف و معرفة الوقوف**) یعنی ترتیل حروف کے صحیح مخارج و صفات کا جاننا اور وقف کے قاعدوں کو پہچاننا ہے۔ سہجتاں چہ مخارج کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جن حروف کا مخرج معلوم کرنا ہو تو اسے ساکن کر کے اس سے پہلے ہمزہ مفتوحہ لگا دیتے ہیں جہاں آواز ٹھہر جاتی ہے۔ وہ اس حروف کا مخرج کہلاتا ہے اگر وہ روایاتِ متواتر کے مطابق ہے تو صحیح ہے ورنہ نہیں۔ پھر بہت سے مخارج ایسے بھی ہیں جن سے کئی کئی حروف ادا

ہوتے ہیں، اس لیے ایسے حروف کے باہمی امتیاز کے لیے بھی صفات متعین ہیں جن سے حروف کے ادا کرنے میں عجیب نفاست اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک ہی مخرج کے تین حروف "ث، ذ، ظ" ہیں۔ "ث" میں ہمس، رخو، استفال اور انفتاح کی چار صفتیں پائی جاتی ہیں، اسی طرح "ذ" میں جہر، رخو، استفال اور انفتاح کی صفات ہیں، لیکن "ظ" میں جہر، رخو، استعلاء، اطباق اور تفخیم کی صفات بھی ہیں۔ سبحان اللہ! حروف کی یہ تمیز اور ان کی صفات کی یہ تفریق ایسی ہے جو دنیا کی کسی زبان کو نصیب نہیں اور بغیر صحیح مشق کے ان کا سمجھنا آسان بھی نہیں۔ اسی طرح ایک مخرج کے تین حروف "ص، ز، س" ہیں۔ یہ تینوں حروف اپنی رخاوت اور صفتِ صفیریہ میں مشترک ہیں، لیکن "ص" اور "س" اپنے ہمس کی وجہ سے اور "ز" اور "س" اپنے استفال اور انفتاح کی وجہ سے مشترک ہیں، جن کا صحیح امتیاز اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب کہ کسی ماہر قاری سے اس کا اجرا کرا لیا جائے، پھر حروف کی تفخیم و ترقیق کے لیے بھی مستقل قاعدے ہیں۔ ان کے علاوہ غنہ، اشمام اور روم وغیرہ بھی متعدد محاسن ہیں جن کی وجہ سے قرآنی صوت میں بڑی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر عربی لحن و لہجہ نہ بھی ہو تب بھی قرآنی قرأت سے مسلم اور غیر مسلم سب ہی حظ اٹھاتے ہیں۔

صوتیات کے لیے قرآن پاک بہت وافر ذخیرہ مہیا کرتا ہے اور اسی کے ساتھ لسانیات کے لیے ایسے اصول پیش کرتا ہے کہ اس فن کی مغربی کتابیں ان سے یکسر خالی ہیں۔

صرف ادغام کے ایسے جامع اور مانع قاعدے ہیں کہ ان سے صوتیات اور لسانیات کے بہت سے پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ ادغام یعنی ایک حرف کو دوسرے حرف میں ملا دینا اور دوسرے کو مشدد کر دینا۔ پہلا حرف جو ملایا جاتا ہے اسے مدغم اور دوسرا حرف جس میں اسے ملاتے ہیں مدغم فیہ کہتے ہیں۔

اس ادغام کے تین قاعدے ہیں: (۱) ادغام مثلین یعنی ایک حرف ساکن کے

بعد وہی حرف پھر آجائے، جیسے **قل لکم اذ ذہب۔ قد دخلو** وغیرہ۔ لیکن جب دو واؤ یا دو دال جمع ہوں تو وہاں ادغام نہ ہوگا بلکہ اظہار ہوگا، جیسے **قالو وہم فی یوم** وغیرہ۔

ادغام کی دوسری قسم ادغام متقاربین ہے، یعنی ایک حرف ساکن کے بعد دوسرا حرف ہم مخرج ہو، جیسے **وقالت طائفۃ۔ قد تبین۔ یلہث ذالک** وغیرہ۔

تیسری قسم ادخام متجانسین ہے، یعنی ایک حرف ساکن کے بعد دوسرا حرف قریبی مخرج کا آئے، جیسے **بل رفعہ اللہ۔ لئن لم۔ مما ینقلب** وغیرہ۔ لیکن حرف حلقی (ء۔ ہ۔ ع۔ ح۔ غ۔ خ) کا ادغام غیر حلقی حروف میں نہیں ہوتا، جیسے **لا تزغ قلوبنا**۔ اس میں "غ" حرف حلقی ہے۔ اس کا ادغام ق میں نہیں ہوگا جو غیر حلقی ہے اسی طرح لام کا ادغام نون میں نہیں ہوتا، جیسے **قلنا**۔ اس میں نون مشدد نہیں ہوگا۔ اسی طرح **یٰسٓ والقرآن الحکیم والقلم** وغیرہ میں ادغام نہیں ہے۔ حالاں کہ مثالوں میں حرف ساکن کے بعد جو حرف آیا ہے وہ قریب المخرج ہے۔ حروف قمریہ جن کا مجموعہ **ابغ حجک وخف عقیمۃ** لام تعریف کے بعد آئیں تو ادغام نہیں بلکہ اظہار ہوگا۔ لیکن ان حروف کے علاوہ دوسرے حرف آئیں جن کو حروف شمسیہ کہا جاتا ہے تو ادغام ہوگا، جیسے **والشمس۔ السلام۔ الرحمن** وغیرہ۔

ادغام کی ایک صورت اقلاب بھی ہے جو اکثر زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ یعنی نونِ ساکن کے بعد یا تنوین کے بعد "ب" آئے تو وہ نون میم سے بدل جائے گا، جیسے **من بعد** کو **مم بعد** پڑھتے ہیں جس طرح **من ما** کو **مما** پڑھتے ہیں۔ اسی طرح **یومئذ ببنیہ** میں تنوین کو میم سے بدل دیتے ہیں۔ یہ سب صورتیں ایسی ہیں جہاں پہلے حرف کی کوئی صفت باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے ان میں ادغام ہوتا ہے اور اسے ادغام تام کہتے ہیں۔ لیکن اگر پہلے حرف ساکن کی کوئی صفت باقی رہے تو اسے ادغام ناقص کہتے ہیں، جیسے **من یشاء۔ من وال** وغیرہ۔ یہ ہیں قرآنی ادغام کے موٹے موٹے قاعدے۔ لیکن پورے جدید علم صوتیات میں یہی قاعدے عام ہیں اور جہاں تک

حروف کے رد و بدل کا تعلق ہے، اساسی حیثیت رکھتے ہیں، خواہ وہ الفاظ لسانیت کے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں ۔ خواہ وہ دخیل الفاظ ہوں، خواہ وہ دوسرے لسانی خاندانوں کے ہوں، کیوں کہ **فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا** کے مصداق انسانی طبائع میں ہر جگہ ادغام مثلین، ادغام متقاربین اور ادغام متجانسین والی تبدیلیاں نظر آتی ہیں، بلکہ تعریب، تفریس اور تہنید کے قاعدے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں ۔ بے محل نہ ہوگا اگر ہم چند مثالیں غیر زبانوں کی بھی پیش کر دیں، مثلاً؛

"ت" کی تبدیلیاں ملاحظہ ہوں: **عتو، عثو** (سرکشی کرنا)، بات، یاد، ستل، سطل (Shuttle) ، ست، سچ وغیرہ ۔

"ج" کی تبدیلیاں ملاحظہ ہوں: جند، جھنڈ، کژدم، کج رم، جمنا، یمنا، جہود، یہود وغیرہ ۔

"گ" اور "ج" بھی آپس میں بدل جاتے ہیں، جیسے گوہر سے جوہر، گلاب سے جلاب، گناہ سے جناح وغیرہ ۔

قرآنی اور عربی الفاظ کی چند تبدیلیاں ملاحظہ ہوں، قیاس سے GUESS، قائد سے QUIDE، مسیطر سے MASTER، مرج سے MERGE، ارض سے EARTH، ضیا سے DAY، عطر سے ODOUR وغیرہ ۔

غرض کہ تعریب اور تفریس وغیرہ میں بھی یہی قاعدے کار فرما ہیں اور صوتیات کے تمام قاعدوں کی اساس قرآنی ادغام پر قائم ہے ۔ رہا علم قرأت تو مسلم شریف کی حدیث ہے کہ **ان اللہ یامرک ان تقری امتک القرآن علی سبعۃ احرف فایما حرف قرء واعلیہ فقد اصابوا** (یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو یہ حکم دیتے ہیں کہ آپؐ کی امت قرآن پاک کو سات لغتوں پر پڑھے تو وہ نازل شدہ لغتوں میں سے) جس لغت پر بھی پڑھیں گے صحیح اور درست کام کرنے والے ہی شمار ہوں گے) ۔ چناں چہ علم قرأت میں جو اختلاف ہوتا ہے وہ تنوع اور تغائر کی قسم سے ہوتا ہے ۔ اس میں تضاد یا تناقض نہیں ہوتا ۔ اس اختلاف کی تین قسمیں ہیں ۔

اول یہ کہ کسی حرف میں تبدیلی ہو جائے، لیکن معنیٰ ایک ہی ہوں، جیسے الصراط اور السراط، صد اور سد، **علیہِم** اور **علیہُم**، **یحسَب** اور **یحسِب**۔

دوسری قسم یہ ہے کہ لفظ اور معنیٰ دونوں میں تبدیلی ہو جائے، لیکن دونوں کا مصداق ایک ہو، یعنی **مالک** اور **ملک** ۔ دونوں حق تعالیٰ کی صفتیں ہیں اور قراء سبعہ میں سے بعض کے نزدیک **ملک** بھی صحیح ہے۔

تیسری قسم وہ ہے کہ لفظ اور معنیٰ دونوں میں تبدیلی ہو جائے اور دونوں کا مصداق بھی جدا جدا ہو، لیکن پھر بھی کوئی ایسی وجہ نکل آئے جو دونوں کو متحد کر دے مثلاً سورہ انعام میں ہے **وھو یطعِم ولا یطعَم** یعنی جماعت قراء کی مشہور قراتوں میں تو پہلا فعل معروف ہے اور دوسرا مجہول، لیکن بعض قراء توں میں اس کا عکس ہے یعنی **وھو یطعَم ولا یطعِم** ۔ اختلاف قرأت سے امت کے لیے وسعت اور آسانی پیدا ہونے کے علاوہ دوسرے فوائد بھی ہیں، یعنی انتہا درجے کی بلاغت اور کامل درجے کا اعجاز بھی ظاہر ہے کہ ایک ہی حرف کی تبدیلی سے مطلب اور مقصد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اور جدا جدا قراتوں میں اختلاف کے باوجود ضدیت اور مخالفت پیدا نہیں ہوتی ۔ ورنہ جس زبانٗ میں زبر اور پیش کے فرق سے معنیٰ پورے کے پورے بدل جاتے ہوں وہ اس اختلاف قرأت کے باوجود کسی ضدیت کی حامل نہیں ۔ علمائے قرأت نے دوسرے فائدے بھی بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اور علامہ شاطبیؒ نے بہت ہی مفید بحث کی ہے ۔ غرض کہ علم قرأت بھی قرأت سبعہ کے اختلافات میں عموماً ادغام کے عام قواعد پر قائم ہے اور تجوید کی ایسی خصوصیات کو اپنائے ہوئے ہے کہ قراء سبعہ ان کے بغیر کوئی قرأت نہیں کر سکتے اور ہر قرأت میں اسی کے قواعد کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔ قرآن پاک کا یہ اعجاز وہ ہے جس کے آگے عقل عاجز ہو کر رہ جاتی ہے اور اللہ پاک کا وہ چیلنج یاد آتا ہے کہ " اور اگر تم شک میں ہو اس چیز (قرآن) کے متعلق جو ہم نے اپنے بندے (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا تو بنا لاؤ اس کی جیسی کوئی سورت، اور لے آؤ اپنے گواہ اللہ کے علاوہ، اگر تم سچے ہو " (البقرہ) ۔

فرائض کی اہمیت

لغت میں فرض کے معنی ہیں کسی حجم والی چیز کو، جس میں سختی اور صلابت ہو "کاٹ دینا"۔ قرآن پاک میں اس کے کئی معنی آئے ہیں؛

(۱) مقرر اور معین کرنا، (۲) عزم کرنا اور اپنے اوپر لازم کر لینا، (۳) واجب کرنا، (۴) اجازت یعنی بندش نہ ہونا۔

شریعت میں فرض اس حکم کو کہتے ہیں جو قطعی اور یقینی دلیل سے ثابت ہو اور بغیر عذر اس کو چھوڑنے والا فاسق اور سخت عذاب کا مستحق ہے اور جو شخص انکار کرے وہ کافر ہے۔ اس حکم میں اوامر اور نواہی دونوں آجاتے ہیں۔ پھر اس فرض کی دو قسمیں ہیں: (۱) فرض عین، (۲) فرض کفایہ۔ فرض عین وہ ہے جس کا کرنا ہر شخص پر ضروری ہے۔ مثلاً کلمہ، شہادت کا دل اور زبان سے اقرار کرنا، پانچ نمازیں ہمیشہ ادا کرنا، صاحبِ نصاب ہونے کی صورت میں زکوٰۃ کا ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا، راستے اور سواری کا خرچ ہونے کی صورت میں حج ادا کرنا وغیرہ۔ اور فرض کفایہ وہ ہے جو ہر شخص پر ضروری نہیں بلکہ بعض لوگوں کے ادا کرنے سے ادا ہو جائے گا۔ جیسے نماز جنازہ یا سلام کا جواب دینا وغیرہ۔

یہ تمام فرائض بظاہر پابندی کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کو مکلف کرنے کے لیے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ بنی آدم کو احسن تقویم پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اسفل السافلین کے گڑھے میں گرنے سے باز رکھتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ کلمہ، شہادت کا دل اور زبان سے اقرار کرنا کیا معنی رکھتا ہے، یہی کہ وہ انسان جو اللہ پاک کا

خلیفہ اور نائب ہے صرف اللہ کے آگے جھکے، صرف اسی کو سب سے بلند سمجھے ۔ اور پھر یہ بات محض عقیدت نہیں بلکہ تجربہ ہے کہ ایک دو آدمی نے نہیں بلکہ لاکھوں، کروڑوں نفوس قدسیہ نے نماز کے ذریعہ عروج اور سربلندی کے ان مراتب تک رسائی حاصل کی ہے کہ آج کل کا آدمی ان کا اندازہ نہیں کر سکتا ۔ اس عبادت نے ان کا تزکیہ کر کے انھیں ایسے کردار کا مالک بنا دیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اگر ان پر کوئی صبر آزما گھڑی آتی تو جزع فزع کے بجائے صبر و صلوۃ ہی کو وہ حرز جان بناتے اور اسی سے سکون حاصل کرتے تھے ۔ آج ہمارے مادی اور روحانی انحطاط کا باعث اور ہماری ساری پریشانیوں کا سبب یہی ہے کہ ہم نے اس کو چھوڑ دیا، اس لیے اللہ پاک نے ہمیں چھوڑ دیا ہے ۔ حالاں کہ یہی وہ عبادت ہے جس کے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ مسلمانوں کی معراج ہے اور اسی عبادت کو حضور نے دین کا ستون فرماتے ہوئے اس کی پابندی کرنے والے کو دین کا قائم کرنے والا اور اس کے تارک کو دین کا منہدم کرنے والا قرار دیا تھا ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم نماز کا تھا کہ "اے لحاف میں لپٹے ہوئے (محبوب) اٹھ اور ہوشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر" ۔ یہ بڑائی نماز سے بیان ہوتی ہے اور غیر اللہ کی نفی سے قائم ہوتی ہے ۔ جس کی وجہ سے خود انسان سربلند ہو جاتا ہے اور اللہ کے علاوہ ہر طاقت کا منکر ہو جاتا ہے ۔ کیوں کہ یہی وہ عبادت ہے جو ہر برائی اور ہر بے حیائی سے باز رکھتی ہے اور انسان کو صحیح معنی میں انسان بنا دیتی ہے ۔ سورہ روم میں ارشاد ہوتا ہے کہ "نماز کو قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ" ۔ اس آیت سے توحید اور ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ترک نماز سے شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "جس دین میں اللہ کے سامنے جھکنا نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں" ۔ سورہ اعلیٰ میں ارشاد ہے کہ

"کامیاب وہ ہے جس نے پاکی حاصل کی اور اللہ کو یاد کیا، پس نماز پڑھی"، یعنی بھلائی اس کے لیے ہے جس نے اللہ کے آگے سر جھکایا اور غیر اللہ سے بیزاری اختیار کر کے خود اپنے منصب خلافت کی شان کو برقرار رکھتا ہے۔ اس فرض عظیم کے قائم کرنے سے ہمارے ذاتی مفاد اور معاشرتی فوائد کے لیے کتنی راہیں کھلتی ہیں؟ محلے کی مسجد میں پانچ مرتبہ جمع ہونا، جامع مسجد میں مختلف محلوں کے لوگوں کا جمع ہونا، عیدین میں پورے شہر اور مضافات کے لوگوں کا ایک جگہ مل کر بیٹھنا۔ کتنے بے مثل معاشرتی نظام کو دعوت ہے؟ کیا دنیا میں اس سے بہتر اخوت اور مساوات کا عالمگیر کوئی اور مظاہرہ ہو سکتا ہے؟

اسلامی تعلیم میں نماز کے ساتھ جو فریضہ سب سے اہم ہے وہ زکوۃ ہے۔ نماز دراصل شوق ہی میں سے ہے اور خود بندے کی عزت نفس کے لیے ہے تاکہ وہ اسفل السافلین کے گڑھے میں نہ گر پڑے۔ لیکن زکوۃ حقوق عباد میں سے ہے اور قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کے لیے حکم ہے وہیں زکوۃ کے لیے بھی ارشاد ہے، تاکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ساتھ ساتھ ادا ہوں اور انسان تارک الدنیا اور گوشہ نشین نہ بنے، بلکہ اپنے عزیزوں، یتیموں، مسکینوں اور دوسرے حاجت مند اور مستحق لوگوں کے لیے مفید بن سکے۔ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو جب قدرے اطمینان ہوا تو سنہ ۲ ہجری میں روزے کے ساتھ ساتھ صدقہ فطر بھی واجب ہوا یعنی کہ سال میں ایک دن عیدالفطر کے موقع پر مسلمان سیر سوا سیر غلہ اللہ کی راہ میں خیرات کرے تاکہ غریب اور محتاج لوگ بھی عید کے دن پیٹ بھر کر گزارہ کر سکیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی تاکید کی گئی۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ "آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ تو آپ فرما دیں کہ تمھاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے، اس کو خیرات کر دو"۔ یہ حکم دراصل زکوۃ کی مقدار اور نصاب کے مقرر ہونے سے پہلے کا ہے لیکن جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں حاصل ہوئیں اور

تجارت کی آمدنی ہوئی تو حکم ہوا کہ اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم تمھارے لیے زمین سے پیدا کریں اس میں سے خیرات کرو۔ یہ خیرات اور زکوٰۃ دوسرے الفاظ میں غریبوں اور مسکینوں کی دستگیری اور اسلام کی تنظیمی زندگی کو استوار کرنے کا ذریعہ ہے، تاکہ مادی طور پر بھی استحکام اور استقامت حاصل ہو سکے۔

نماز اور زکوٰۃ کے بعد اہم فرض روزہ ہے۔ روزہ کی حقیقت پر غور کیجیے کہ ایک روزہ دار مسلمان خدا کے حکم سے تمام لذتوں کو چھوڑ دیتا ہے اور بھوک پیاس کی سختی محض اس لیے برداشت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور روزہ دار کا یہ عمل صرف مجمع تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ تنہائی میں بھی اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگرچہ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا ہے لیکن خدا تو دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور روزہ دار کو ایک طرف برائی سے بچاتا ہے تو دوسری طرف بھوکوں اور پریشان حال لوگوں سے اس کو ہمدردی اور تعاون پر ابھارتا ہے۔

یہی حال حج کا ہے کہ اپنے وطن اور اہل و عیال کو چھوڑ کر خدا کے حکم سے ایک ہی طرح کا لباس پہن کر ایک ہی گھر کے گرد تمام دنیا کے مسلمان گھومتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تمام علائق دنیوی سے انقطاع کا تصور پختہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک عالمگیر اسلامی برادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

غرض یہ فرائض افراد کے اصلاح احوال میں مدد دیتے ہیں تو اجتماعی حالات بھی درست کرتے ہیں۔

سخت کوشی

قرآن حکیم کو اللہ پاک نے ہمارے لیے ایک ایسی مشعل ہدایت بنا کر بھیجا ہے ۔جس کی روشنی سے تمام برائیوں اور خرابیوں کی تاریکی دور ہو سکتی ہے اور انسان اپنے بلند مقام کو قائم رکھ سکتا ہے ۔قرآن پاک میں صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان بہترین سانچے میں ڈھالا گیا ہے ۔ **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**o یہ ایک ایسی بشارت ہے جو ہر خیر و فلاح کی آئینہ دار ہے اور انسان کو اس کی بلند و ارفع خلقت کی یاد دہانی کرتی ہے ۔اسی طرح اس کی فضیلت کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہے کہ **ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر و البحر ورزقنھم من الطیبات و فضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا** o (البتہ ہم نے آدم کی اولاد کو بزرگی دی اور ان کو سوار کر دیا یعنی مسلط کر دیا خشکی اور تری پر اور ان کو روزی دی اچھی اچھی چیزوں سے اور ان کو بڑی فضیلت دی بہتوں پر جس کو ہم نے پیدا کیا ہے ۔) یہ اور ایسی تمام آیتیں ایک انسان کے بلند درجے کو متعین کرتی ہے اور اللہ پاک کے بے پایاں انعامات کو یاد دلاتی ہیں ۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی فرما دیا کہ **وجعلنکم خلئف فی الارض**، یعنی ہم نے تم کو اس دنیا میں اپنا نائب اور خلیفہ بنا دیا ہے ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ پوری کائنات مین تمام مخلوقات سے افضل انسان ہے اور اس سے بلند و ارفع صرف اللہ پاک کی ذات ہے ۔دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اللہ پاک کے بعد ہی انسان کا درجہ ہے، جس کی صلاحیتوں کے متعلق ایک جگہ یوں بھی فرمایا ہے کہ **سخر لکم مافی**

السموات والارض، یعنی ہم نے تمھارے لیے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب مسخر کر دیا۔ مطلب یہ کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے اس پر قبضہ کرنے کی پوری پوری صلاحیتیں انسان کے اندر ودیعت کر دی گئی ہیں ۔ پھر ایک جگہ ارشاد ہے کہ **ان الارض یرثھا عبادی الصلحون** ۝ یعنی اس زمین کے مالک میرے صالح اور نیک بندے ہوں گے ۔

ایسی بشارتوں سے واضح ہے کہ انسان میں جو خفتہ صلاحیتیں ہیں ان کو بیدار کرنا اس کا فرض عین ہے اور یہ صلاحیتیں اللہ کے صالح اور نیک بندوں میں بہت زیادہ ہوا کرتی ہیں ۔

دنیا عالم اسباب ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ بغیر کھائے ہوئے خود بخود کھانا پیٹ میں چلا جائے یا بغیر کام کیے ہوئے کام خود بخود ہو جائے ۔ انسانی زندگی عمل سے عبارت ہے ۔ بغیر عمل کے زندگی، زندگی نہیں کہلائی جا سکتی ۔ اسی لیے ہمارا دین تارک الدنیا ہونا نہیں سکھلاتا ۔ رہبانیت اور گوشہ نشینی ہمارے دین کے خلاف ہے ۔ ہمارے اللہ کی حکومت آسمانوں اور زمین میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کی حفاظت جب اس کو نہیں تھکاتی تو پھر اس کے بندے بھی ہاتھ پیر توڑ کر نہیں بیٹھ سکتے ۔ انھیں عمل ہی پیش کرنا ہے ۔ عمل ہی سے زندگی بنتی ہے اور عمل ہی زندگی کی دلیل ہے ۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا مابانفسہم ۝

(ترجمہ)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

جب تک ہماری قوم اپنی حالت کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہو گی، اس وقت تک خدا کی مدد بھی شامل حال نہیں ہو سکتی اور ہماری حالت اسی وقت بدل سکتی ہے

جب ہم ان تھک کوشش اور پیہم جستجو کریں۔ معمولی عمل نہیں بلکہ غیر معمولی عمل اور سخت کوشی ہی سے کامیابی پیدا ہو سکتی ہے۔

یعنی جب تک مشکلات کا مقابلہ نہ کیا جائے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ خود ہمارا کلمہ، طیبہ ہمارے لیے تن دہی اور جان کاہی کا پیام ہے۔ **لا الٰہ** کے معنی صرف غیر اللہ کی عبادت سے انکار نہیں بلکہ ہر مشکل، ہر دقت اور ہر طاقت کا انکار ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر اللہ کے بندے بننے کے لائق نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم کسی مشکل سے گھبرا جائیں یا کسی وقت باطل سے پریشان ہو کر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے اللہ کے علاوہ اس مشکل یا دقت کو ایک طاقت سمجھ لیا جو ہم کو ڈرا سکتی ہے یا مرعوب کر سکتی ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک کسی مشکل یا دقت سے ڈرنا بھی ایک قسم کا شرک ہے جو اسلام کی تعلیم کے منافی ہے اور توحید کے عقیدے کے بھی خلاف ہے۔ اسی چیز کو اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ، علم کلام !

اسلام کے ارکان میں جہاد بھی شامل ہے، یعنی اللہ کی راہ میں اور صرف اللہ کی رضا کے لیے سخت کوشی اختیار کرنا جہاد ہے۔ یہ کوشش مختلف نوعیتوں کی ہو سکتی ہے، مثلاً؛ اپنے نفس کو احکام الٰہی کا تابع بنانا، اللہ کے دین کو تقریر و تحریر سے افضل و برتر ثابت کرنا، اللہ کے دین کو حکمت اور موعظت سے دوسروں تک پہنچانا اور اس سلسلے میں ہر طرح کی تکلیف اٹھانا اور ہر نقصان کو برداشت کرنا بھی جہاد ہے۔ اللہ کے دین کے تحفظ اور اس کے غلبہ کے لیے باقاعدہ قتال کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ خواہ یہ جنگ و قتال ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند ہو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ جنگ مسلمان بھی کرتا ہے اور غیر مسلم بھی کرتا ہے،

لیکن دونوں کی جنگ کی الگ الگ کیفیتیں ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہوئے، وہ شیطان کی راہ میں جنگ کرتے ہیں ۔ پس تم شیطان کے مددگاروں سے جنگ کرو ۔ بیشک شیطان کا حیلہ کمزور ہوتا ہے ۔ اس ارشاد میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے یا اس کو غالب رکھنے کے لیے جنگ کرنا جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کے سوا کسی اور کے غلبہ یا حکومت کے لیے جنگ کرنا شیطان یا طاغوت کی راہ میں جنگ کرنا ہے ۔ پھر اس جنگ کے لیے تیاری کرنے اور سخت کوشی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

اعدو الھم مااستطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدواللہ وعدوکم وآخرین من دونھم لاتعلمونھم اللہ یعلمھم وماتنفقو من شیء فی سبیل اللہ یوف الیکم وانتم لاتظلمون o

یعنی "تم تیار رکھا کرو ان کے لیے جتنا تم سے ہوسکے، قوت کی چیزیں اور جنگی گھوڑے، جس سے ڈرتے رہیں اللہ کے دشمن اور تمھارے دشمن اور دوسرے بھی، ان کے سوا جن کو تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے ۔ ان کاموں کے لیے جو کچھ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کروگے تم کو پورا پورا دے دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا" ۔

اس آیت میں لفظ قوت کے ذیل میں وہ تمام چیزیں آگئیں جو بطور اسلحہ استعمال ہوتی ہیں اور جسمانی مشقت و تربیت کے ذریعے سپاہیوں میں جن قابلیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ۔ رباط الخیل (گھوڑوں کی بندھی قطار) میں فولادی گاڑیاں، ٹینک، ہوائی جہاز، جنگی بحری جہاز اور اسی قسم کی چیزیں آجاتی ہیں ۔ **وآخرین من دونھم** سے مراد وہ کافر، منافق اور اسلام کے دشمن ہیں جن کی مخالفت اور عداوت عام طور پر ظاہر نہ ہو لیکن وہ گھات لگائے موقع کے منتظر ہوں ۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ اللہ پاک نے جہاد اور اسی طرح ہر معاملے میں جدوجہد اور سخت کوشی کو ضروری قرار دیا ہے اور اس کے برعکس سہولت پسندی، تن آسانی اور آرام طلبی کو ناپسند فرمایا ہے ۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں، جس نے شمشیر و سناں کو پس پشت رکھ کر طاؤس و رباب ہی سے قوت اور شوکت حاصل کی ہو اور بغیر سختی برداشت کیے ہوئے کوئی عزت یا جاہ و مرتبہ حاصل کیا ہو۔ پھر یہ جاہ و جلال بغیر اصول اور ڈسپلن کے حاصل نہیں ہوتا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ اگر دنیوی اعزاز کوئی مرتبہ رکھتا تو وہ کافروں کو حاصل نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی عزت اور طاقت کا مدار سخت کوشی اور اپنے اصول کی سختی سے پابندی کرنے پر ہے۔

سورہ والعصر میں بھی اللہ پاک نے ہماری کامیابی اور فلاح کے طریقے بتا دیے ہیں اور فرمایا ہے کہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈال کے دیکھ لو کہ بیشک انسان گھاٹے میں ہے۔ لیکن وہ انسان گھاٹے میں نہیں ہے جو ایمان لائے اور عمل صالح پیش کیے۔ نیز ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔ اس چھوٹی سی سورت میں اللہ پاک نے ہماری فلاح اور کامیابی کے طریقے اجمالاً بیان کر دیے ہیں اور (۱) ایمان اور (۲) عمل صالح کو انفرادی زندگی کی کامیابی کے لیے ضروری قرار دیا ہے اور (۳) حق، نیز (۴) صبر کو اجتماعی زندگی کے لیے ضروری بنایا ہے کیوں کہ اجتماعی فلاح ان دو اصولوں کے بغیر ممکن نہیں۔ کیا صادق اور امین نہ ہو کر بھی کوئی شخص معاشرتی زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے اور کیا ایمان عمل صالح کی دولت کے بغیر کوئی فرد اپنی انفرادی زندگی میں سکون حاصل کر سکتا ہے؟ اگر ہماری قوم صادق اور امین ہو، لالچ اور خوف سے پاک ہو اور کسی قیمت پر ہماری قوم کا ایمان اور عمل خریدا نہ جا سکے تو یقیناً ہماری ساکھ دنیا میں قائم ہو جائے گی۔ دوسرے کے دلوں میں ہماری عزت بیٹھ جائے گی اور ہماری بات میں وزن ہوگا۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے پاس دولت نہ تھی، وہ جھونپڑیوں اور کمبل کے خیموں میں رہتے تھے، ظاہری شان و شوکت سے ناآشنا تھے، نہ ان کے لباس درست تھے، نہ غذا مرغن تھی اور نہ سواریاں شاندار تھیں۔ لیکن وہ سخت کوش تھے اور اپنے اصول کے سخت پابند، اسی لیے انھوں نے اپنی عزت اور عظمت کا سکہ بٹھا

دیا تھا اور کسی قوم میں طاقت نہ تھی کہ ان کا مقابلہ کر سکے۔

سورہ انشراح میں بھی مکرر عسر کو یسر کا پیش خیمہ بتایا گیا ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری پیش کر کے ان کی عملی زندگی کے مصائب کا ذکر ہے۔ پھر ان مصائب پر قابو پانے کے سلسلے میں بتایا ہے کہ سختی برداشت کرنے کے بعد ہی آسانی حاصل ہوتی ہے، یعنی مشقت اور سختی ہر کامیابی کے لیے ضروری شرط ہے۔ یسر کا دامن ہر حال میں عسر کے ساتھ وابستہ ہے۔

قرآن حکیم نہایت وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ تم ہی سربلند ہو گے اگر تم مومن ہو اور اللہ کی جماعت ہی غالب ہو گی اور جو لوگ ایمان اور عمل صالح سے آراستہ ہوں گے ان کو زمین کی خلافت ضرور ملے گی۔ اس وثوق کی بنا کیا ہے؟ یعنی یہ دعویٰ کیوں ہے کہ دوسری قومیں خواہ کیسے ہی مادی وسائل کی مالک ہوں، ان پر مسلمان اپنے ایمان اور عمل صالح سے غالب آجائیں گے۔ اس دعویٰ کا جواب سورہ حج اور عنکبوت میں موجود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مادی طاقتوں پر بھروسا رکھتے ہیں وہ خود اپنی جگہ کسی قسم کی قوت اور قدرت نہیں رکھتے۔ ایسی چیزوں پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بھی اپنے بے زور سہاروں کی طرح بے زور ثابت ہوتے ہیں اور وہ اپنے نزدیک جو مستحکم قلعے بناتے ہیں وہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہیں اور ان میں کبھی یہ طاقت نہیں ہو سکتی کہ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں سر اٹھا سکیں جو حقیقی قدرت اور عزت رکھنے والے خدا پر اعتماد رکھتے ہیں۔ بہرحال اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنے کے لیے بھی دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور سخت کوشی سے یہ دشواریاں رفع ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے خوب کہا ہے کہ

سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

تسلیم ورضا

تسلیم کے کئی معنی آتے ہیں ۔ سلام بھیجنا، سونپنا، سر اطاعت خم کرنا ۔ یہ لفظ بروزن تفعیل مصدر ہے ۔ اسی سے مشتق اسلام ہے جو بروزن افعال مصدر ہے ۔ دین اسلام، تابعداری کرنا اور مسلمان ہونا معنی رکھتا ہے، چناں چہ اسلام کی صحیح صورت یہ ہے کہ زبان کے اعتراف کے ساتھ دل سے بھی اعتقاد ہو اور اس اعتقاد کو عمل سے پورا کیا جائے اور قضاو قدرِ الٰہی کے آگے گردن جھکا دی جائے ۔ اسی طرح رضا کے معنی بقول امام راغبؒ یہ ہیں کہ "جو بندے پر قضائے الٰہی جاری ہو وہ اسے مکروہ نہ سمجھے اور اللہ کا بندے سے راضی ہونا یہ ہے کہ اس کو وہ اپنے حکم کا تابعدار اور اپنی نہی سے پرہیز گار دیکھے ۔

تسلیم ورضا سے معاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے واقعات نظر کے سامنے آجاتے ہیں ۔ ان کے فضائل بے شمار ہیں ۔ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی پیغمبروں میں سب سے افضل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جو ہمارے آقا کے جدامجد ہیں اور تشہد میں درود کے وقت ان کا نام بھی لیا جاتا ہے ۔ حدیث معراج میں مذکور ہے کہ حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں آسمان پر آپ کو اس حال میں دیکھا تھا کہ آپ بیت المعمور سے اپنی پیٹھ لگائے ہوئے تھے ۔ ان کے اجمالی حالات جو "تسلیم ورضا" کا آئینہ ہیں، اس طرح ہیں کہ آپ نے بعثت کے بعد سب سے پہلے اپنے والد آزر کو حق کی تبلیغ کی، پھر اپنی قوم کو سمجھایا، پھر بادشاہِ وقت نمرود سے مناظرہ کیا، جس نے آپ کو دہکتی ہوئی آگ

میں ڈال دیا ۔ اس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے : **اللھم فی السماء واحد وانا فی الارض واحد عبدک** اے اللہ بے شک تو آسمان میں واحد ہے اور میں زمین میں تیرا واحد پرستار ہوں ۔ آپ پر آگ بردو سلام بن گئی ۔ لیکن پھر آپ اپنی زوجہ حضرت سارہ اور اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مصر پہنچے ۔ وہاں کے بادشاہ نے اپنی صاحبزادی حضرت ہاجرہ کو آپ کی زوجیت میں دے دیا اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے ۔ پھر اللہ پاک کے حکم سے آپ نے حضرت ہاجرہ اور ان کے نومولود بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں تنہا چھوڑ دیا اور خود فلسطین میں قیام کیا، لیکن کبھی کبھی مکہ معظمہ آجاتے تھے ۔ پھر خدا کے حکم سے باپ بیٹے نے خانہ، کعبہ تعمیر کیا اور دونوں کی زبان سے یہ دعا نکلتی تھی کہ **ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم** یعنی اے پروردگار ہمارا یہ عمل قبول فرما، بے شک تو ہی تمام دعاؤں کا سننے والا ہے اور تمام علم والا ہے ۔

پھر سورہ، والصفت میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کا واقعہ بھی آتا ہے

فلما بلغ معه السعی قال یابنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری قال یابت افعل ماتؤمر ستجدنی ان شاء الله من الصابرین ٥ فلما اسلما وتله للجبین ٥ ونادینه ان یا ابراهیم ٥ قدصدقت الرءیا ان کذالک نجزی المحسنین ٥ ان هذا لهو البلؤ المبین ٥ وفدینه بذبح عظیم ٥ وترکنا علیه فی الآخرین ٥ سلم علی ابراهیم ٥ کذالک نجزی المحسنین ٥ انه من عبادنا المؤمنین ٥

" یعنی وہ بچہ یعنی اسمٰعیل علیہ السلام اپنے والد حضرت ابراھیم علیہ السلام کے ساتھ چلنے پھرنے لگے تو ابراھیم علیہ السلام نے کہا: بیٹا! میں خواب میں (کیا) دیکھتا ہوں کہ جیسے میں تم کو ذبح کر رہا ہوں ۔ پس تم (اپنی جگہ) سوچو کہ تمھاری کیا رائے

ہے ؟ (بیٹے نے) کہا کہ ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے (بلا تامل) اس کی تعمیل کیجیے ۔ ان شاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے ۔ پھر جب دونوں (باپ بیٹے) تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے اور باپ نے (ذبح کرنے کے لیے) بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑا تو (ہم کو ان کی فرماں برداری نہایت پسند آئی) اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پکار کر کہا اے ابراہیم! تو نے اپنے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (اب ہم تم کو بڑے بڑے مرتبے دیں گے اور) نیک بندوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ۔ بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی ۔ اور ہم نے بڑی قربانی کو اسمٰعیل کا فدیہ دیا اور (ابراہیم علیہ السلام کے بعد) آنے والی امتوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا کہ (سارے جہاں میں یہی آواز ہو رہی ہے کہ ابراہیم پر سلام ہو ۔ ہم نیک بندوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں) اور اس میں شک نہیں کہ ابراہیم ہمارے ایمان دار بندوں میں ہیں ۔"

ان تمام واقعات کو اگر ہم اپنے الفاظ میں اجمالاً بیان کریں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کی کڑی آزمائش کے لیے پہلے کہا گیا کہ اپنے بت پرست باپ کو چھوڑ دو ۔ عرض کیا، اچھی بات ہے ۔ پھر حکم ہوا، آگ میں کود جاؤ ۔ عرض کیا، حاضر ہوں پھر حکم ہوا، وطن چھوڑ دو ۔ عرض کیا، اچھی بات ہے ۔ پھر کہا مصر سے مکہ جاکر اپنی بیوی اور بچے کو بے سہارا چھوڑ آؤ ۔ عرض کیا، بالکل حاضر ہوں ۔ پھر مکہ میں حکم ہوا کہ معصوم بچے سے مٹی اٹھوا کر خانہ ، کعبہ تعمیر کرو ۔ جواب دیا، بالکل یہی کروں گا ۔ پھر حکم ہوا، اب اس بچے کو جس نے بے سہارا زندگی گزاری ہے، ہماری راہ میں ذبح کر دو عرض کیا، بالکل اسی طرح کروں گا ۔ چناں چہ ایسا کرنے کے لیے اپنے بچے کو پچھاڑا تو رحمت جوش میں آگئی اور کہا گیا کہ ابراہیم تمھارا بہت بڑا امتحان لیا گیا اور تم کامیاب ہوئے ۔ اب ہم ہمیشہ کے لیے آنے والی امتوں میں تمھارا ذکر خیر باقی رکھیں گے ۔

"تسلیم و رضا" کا یہ پورا امتحان دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے اور انسانی عقل حیران ہے ۔ اطاعت و فرمانبرداری، ایثار و قربانی، پھر فلاح و کامرانی کی نادر مثال حضرت

ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی زندگیاں ہیں۔انھوں نے ہم کو یہی پیام دیا کہ اللہ کے حکم کے آگے چوں وچرا کے کوئی سوالات نہیں آسکتے اور اس کی راہ میں عقل کا نہیں عشق کا سہارا چاہیے۔اللہ پاک نے اپنے ان نیک بندوں کے ذکر خیر کو عشق کی علامت بنا کر جس طرح قائم رکھا ہے وہ حج کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ انھوں نے اپنا وطن چھوڑا تو حاجیوں کو بھی وطن چھوڑنا پڑتا ہے، ورنہ حج نہیں ہوتا۔ پھر انھوں نے چکر کھائے تو حاجی بھی کفن کی دو چادریں لپیٹ کر طواف کرتا ہے، ورنہ حج نہیں ہوتا۔ حضرت ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے پانی کی تلاش میں سعی کی تو حاجی بھی صفا اور مروہ کے درمیان بھاگتا ہے، ورنہ حج نہیں ہوتا۔ خدا کے پیاروں نے گھر بار چھوڑ کر منیٰ اور عرفات میں یکسوئی کے ساتھ اس سے رشتہ جوڑا، حاجی کو بھی یہی کرنا پڑتا ہے، ورنہ اس کا حج نہیں ہوتا۔ پھر انھوں نے قربانیاں دیں تو اس آفاقی حاجی کے لیے بھی قربانی ضروری ہوئی، ورنہ حج نہیں ہوگا۔ غرض کہ اللہ پاک نے اپنے محبوب بندوں کے ذکر خیر کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اور تسلیم و رضا کی یادگار منانے کے لیے فریضہ حج کو قیامت تک کے لیے باقی رکھا ہے اور قربانیوں ہی سے ہماری زندگی میں تازگی بخشی ہے اور پھر یہ قربانی جو بظاہر "جانور" کی ہوتی ہے، جس طرح ایک یادگار منانے کے لیے ہے، اسی طرح اپنے اندر بڑی مصلحتیں رکھتی ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ **لن ینال اللہ لحومها ولا دماءها ولکن یناله التقوی** یعنی ان کے گوشت اور خون خدا کے پاس کبھی نہیں پہنچتے، لیکن تمھاری پرہیزگاری پہنچتی ہے۔ پرہیزگاری اور تقویٰ کیا ہے یہی ہے کہ بچنا اور محفوظ رہنا۔ جس کی اقسام بکثرت ہیں، یعنی ہر برائی سے بچنا اور اللہ کے لیے اخلاص پیدا کرنا۔ اصل تقویٰ ہے محض اللہ پاک کی رضا جوئی۔ اس کے حکم کی تعمیل میں سنتِ ابراہیم کو قائم کرنا بھی تقویٰ ہے۔ دکھاوا، شہرت طلبی اور ناموری کی خواہش نہ ہو، بخل اور تنگ دلی دور ہو۔ بہیمی قوتوں کی پرورش نہ ہو اور اپنا مال دوسروں کے کام میں لانا بذاتِ خود اخلاص اور تقویٰ

کی دلیل ہے۔ اللہ پاک سے جب یہ رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے تو پھر ایک مومن یقیناً اللہ والا ہو جاتا ہے (**ان صلوٰتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العٰلمین**) یعنی اس مومن کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ "بے شک میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔ یہ خلوص اور یہ قربانی ایک مومن کی شرک سے حفاظت کا بھی ایک ذریعہ بن جاتی ہے، مسلمانوں کے عقیدہ، توحید میں تازگی پیدا کرتی ہے اور انھیں سبق دیتی ہے کہ حیوانات دراصل اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح ہونے اور اس کی بارگاہ میں قرب کا ذریعہ بننے کے لیے ہیں، پرستش کے لیے نہیں ہیں۔ پھر یہ قربانی حجاج کے ساتھ مشابہت کی خاطر بھی ہے جو محض "تسلیم و رضا" کے لیے اتنی دور دراز کے سفر کو اختیار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے "حجتہ اللہ البالغہ" میں لکھا ہے کہ عیدالاضحیٰ میں جب تک نماز سے فارغ نہ ہو کچھ نہ کھائے، پھر اپنی قربانی کا گوشت کھائے، کیوں کہ اس میں قربانی کی عظمت اور اس کی طرف رغبت کا ہونا اور اس کا متبرک سمجھنا، پایا جاتا ہے اور نماز کے بعد قربانی کرے، کیوں کر ذبح کرنا محض حجاج کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے عبادت شمار کیا جاتا ہے اور یہ مشابہت نماز کے لیے جمع ہونے سے ان کو حاصل ہو سکتی ہے۔

تسلیم و رضا کی مکی زندگی جس سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر جھک گئی (**انقض ظھرک**) اور سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، کوثر کے انعام کا پیش خیمہ تھی، جس کے شکر کے لیے **فصل لربک وانحر** (یعنی پس نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے) کا حکم ہوا، یعنی تسلیم و رضا نے ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ اسلام کے ذکر کو دوام بخشا اور اسی نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو بلند کیا **ورفعنا لک ذکر** (اور ہم نے بلند کیا آپ کے ذکر کو)۔

فضول خرچی

انسان ضرورتوں کا مجسمہ ہے ۔ اسے ہر لحہ اور ہر ساعت کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں جب تک زندہ رہنے کی صلاحیت ہے کسی نہ کسی مقصد کے لیے سرگرداں رہنا پڑتا ہے ۔ اگر یہ مقصد اور اس کا ذریعہ دونوں شرع کے مطابق ہوں تو پھر ایسے فرد کی زندگی صالح اور پاکیزہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص احسن التقویم کے درجے سے گر جاتا ہے سچتاں چہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جسے، روٹی، کپڑے اور مکان کی ضرورت نہ محسوس ہوتی ہو ۔ روٹی کی حقیقت اور اہمیت کے متعلق حضرت سعدیؒ کا یہ قول بارہا سنا ہوگا کہ "خوردن برائے زیستن و ذکر کردن ست"، یعنی کھانا اتنا چاہیے جو زندہ رہنے اور اللہ کی یاد کرنے کے لیے کافی ہوسکے حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی میں کبھی دو وقت سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا ۔ ایک اور حدیث ہے کہ حضورؐ نے پوری حیاتِ طیبہ میں مسلسل تین روز تک دونوں وقت سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا ۔ پھر ایک اور حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک معدہ میں جتنا کھانا آسکتا ہے اس کا صرف ایک تہائی کھانا چاہیے اور بقیہ دو تہائی دوسرے افراد کے لیے ہونا چاہیے ۔ یہ تو ہوئی کھانے کی حقیقت، اب کپڑے کی حقیقت سن لیجیے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی کپڑا دھلا ہوا، رکھا نہیں ہوتا تھا ۔ یعنی ایک ہی جوڑے کو دھو دھو کر پہن لیا کرتے تھے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان کے لیے ایک جوڑا کپڑا سردی سے بچنے کے لیے اور ایک جوڑا گرمی سے بچنے کے لیے کافی ہے ۔ اب مکان کی حقیقت بھی سن لیجیے ۔

ایک صحابی نے اپنا مٹی کا مکان ذرا اونچا بنا لیا۔ خدمت میں حاضر ہوئے، سلام عرض کیا، تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا۔ پھر سلام کیا، تو پھر منہ پھیر لیا۔ تیسری بار پھر سلام پیش کیا، تو پھر منہ پھیر لیا۔ اس طرح وہ صحابی سمجھ گئے کہ حضورؐ ناراض ہیں سہجتاں چہ وہ جلدی سے گئے اور مکان مسمار کر دیا۔ اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں روٹی، کپڑا اور مکان کی اہمیت صرف جینے کے لیے ہے اور بس۔ اب قرآن پاک کی یہ آیت پڑھئے: **ویسئلونک ماذاینفقون ۔ قل العفو** یعنی ارشادِ خداوندی یہ ہے کہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ تو آپؐ فرما دیں کہ ہر وہ چیز جو تمھارے خرچ سے زیادہ ہو، یعنی جو کچھ بھی تمھارے اور تمھارے اہل و عیال کے خرچ سے زیادہ ہو وہ اللہ کی راہ میں لگا دیا جائے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ خرچ کے باب میں جس کو دنیا و آخرت دونوں سے تعلق ہے، پہلے سوچ لیا کرو کہ یہ خرچ کرنا حکم الہٰی کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر ایسا ہو تو خرچ کر دو ورنہ نہیں اور اس حکم کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی کسی معصیت میں خرچ کرتا ہے تو مطلقاً ناجائز ہے اور اگر طاعت میں خرچ کرتا ہے اور وہ طاعت واجب اور فرض کی حد تک پہنچتی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ وغیرہ، تو یہ خرچ فرض و واجب ہے اور اگر نفل کی حد تک پہنچتی ہے جیسے معمولی خیر خیرات، تو اگر کسی عیال وغیرہ کا حق ایسے خرچ میں ضائع ہوتا ہے تو پھر ایسا خرچ جائز نہیں اور اگر کسی کا حق ضائع نہیں ہوتا لیکن خود پریشانی میں پڑ جائے گا اور صبر نہ کر سکے گا تو پھر ایسا خرچ بھی ناجائز ہے اور اگر وہ طاعت کا محل ہے نہ معصیت کا، بلکہ مباح ہے، جیسے لذیذ کھانے، تو اگر ان چیزوں سے نیت اللہ کی طاعت میں قوت ہے تو ثواب ہے اور اگر معصیت کی تقویت مقصود ہے تو گناہ ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرنے سے متعلق سورۃ البقرہ کی آیت ۲۶۵ میں ہے: "اور ان لوگوں کی مثال، جو اپنا مال اللہ پاک کی رضا کے لیے اور اپنے آپ کو مضبوط کرنے میں خرچ کرتے ہیں۔ اس باغ کی ہے جو اونچی زمین پر ہو۔ اس پر زور کی بارش پڑے اور وہ اپنے پھل دوگنے دے اور اگر زور کی بارش نہ ہو تو ہلکی پھوہار ہی کافی ہے اور جو کچھ تم کرتے

ہو اللہ خوب دیکھتا ہے"۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے لیے مال خرچ کرنے سے ایمان میں ثابت قدمی بڑھتی ہے اور اپنے آپ کو مضبوط کرنے میں مدد ملتی ہے۔

"ہم خرما و ہم ثواب اس سے ہمارے ایمان اور ہماری ظاہری اور باطنی قوت کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ فضول خرچی کے لیے دوسرا لفظ اسراف ہے، لیکن اس کے عام معنی حد تک گزر جانے کے بھی ہیں۔ جیسے اس آیت میں ہے کہ **ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا** (یعنی اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے اور ہمارے حد سے گزر جانے کو معاف کر دے) البتہ غیر ضروری کام پر خرچ کرنے اور پیسے کو ضائع کرنے کو تبذیر کہتے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے: **وآت ذا القربی حقه والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیراً ○ ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطٰن لربه کفوراً ○**

یعنی "اور قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا اور محتاج مسافر کو بھی دیتے رہنا اور بے موقع مت اڑانا، بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے"۔

بظاہر اسراف اور تبذیر کا حاصل ایک ہی ہے کہ معصیب کے محل میں خرچ کیا جائے، خواہ وہ خرچ شراب وغیرہ پر ہو یا خواہ شہرت یا ریا کے لیے ہو۔ لیکن بعض علما نے اسراف اور تبذیر میں فرق کیا ہے۔ اسراف یہ ہے کہ حقوق سے تجاوز کیا جائے اور تبذیر یہ ہے کہ محل و موقع سمجھے بغیر کام کیا جائے۔ بہر حال فضول خرچی کا تعلق اسراف اور تبذیر دونوں سے ہے۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں علماء نے وضاحت کی ہے کہ ہر شخص اپنے پیشے اور منصب کے لحاظ سے اعتدال میں رہ کر خرچ کر سکتا ہے خرچ کے پانچ درجے بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ ضرورت، ۲۔ حاجت، ۳۔ منفعت، ۴۔ زینت اور ۵۔ فضول، یعنی بے کار اور بے جا خرچ۔ پھر ان پانچوں قسموں کی صراحت ہے؛

۱۔ ضرورت تو یہ ہے کہ اگر ممنوع (اور حرام) چیز کا استعمال نہ کرے تو ہلاک ہو جائے یا ہلاکت کے قریب پہنچ جائے۔ اس صورت میں ممنوع چیز کے استعمال کی اجازت ہے۔

۲۔ حاجت کی مثال یہ ہے کہ ایک بھوکا آدمی جب اگر کھانے کے لیے کچھ نہ ملے تب بھی ہلاک تو نہ ہو لیکن تکلیف اور مشقت اٹھانی پڑے۔

۳۔ منفعت کی مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی گیہوں کی روٹی، بکری کا گوشت اور مرغن غذا کھانا پسند کرے۔

۴۔ زینت کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص غذا میں میٹھا کھانا پسند کرے، لیکن

۵۔ فضول کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھانے پینے میں حرام و حلال کی تمیز نہ کرے اور سب کچھ جائز سمجھے۔ اس وضاحت کے بعد فضول خرچی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے اور اس کے ناجائز ہونے کی حقیقت بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اب ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ہمارے کون کون سے کام اس فضول خرچی کے ذیل میں آتے ہیں اور ان کے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی نقصانات کس قدر ہوتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ ہم نے حرام و حلال کی تمیز اٹھا دی ہے اور ہم نے غلط کو جائز ٹھہرانے کے لیے تاویلیں گھڑ لی ہیں۔ پھر فضول خرچی کو جائز ٹھہرانے کے لیے جو چیزیں ثواب سمجھ کر کی جاتی ہیں وہ رسم و رواج میں داخل کر لی گئی ہیں۔ شادی غمی کی رسمیں، عید، بقرعید کے لیے من گھڑت طریقے، مختلف مہینوں کے لیے مختلف کھانے شامل ہیں۔ بکثرت چیزیں ایسی رائج ہیں جنھیں عین ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے اور ان کے بغیر ہمارا معاشرہ خالی خولی سمجھا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں کیا ایسی نہیں جنھیں ترک کر دیا جائے اور قوم کو خواہ مخواہ کے مصارف سے بچایا جائے؟ والدین، قریبی رشتہ دار، یتیم، مسکین، مسافر، سائل، ہمسائے، یقینی ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ رفاہ عامہ اور ملکی دفاع وغیرہ بے شمار مدیں ایسی ہیں جن پر خرچ کرنا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے اور یہی صحیح خرچ ہے۔

اتحادِ ملت

جب ہم اپنے معاشرے اور ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو خود اپنی بقا اور تحفظ کے لیے اتحاد و اتفاق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ کیوں کہ زندگی تنہا گزاری نہیں جاسکتی، اس زندگی کے لیے پوری کائنات کا نظام قائم ہے ۔

کون ہے جو چاند، سورج، دن، رات، زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے ان سب کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے ۔ انسان تمام کائنات سے فائدہ اٹھانے کے لیے مجبور ہے اور بغیر اتفاق و اتحاد کے اسے سکون نصیب نہیں، ملت بھی اسی اتحاد و اتفاق کا لطیف نام ہے ۔ امام راغبؒ نے المفردات میں لکھا ہے کہ دین کی طرح ملت بھی اس دستورِ الہیٰ کا نام ہے جو اللہ اپنے بندوں کے لیے جاری فرماتا ہے، تاکہ اس پر چل کر قربِ الہیٰ حاصل کر سکے اور یہ دستور انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے بندوں تک پہنچتا ہے ۔ قرآن پاک میں اللہ نے ہماری جمعیت اور یک جہتی کے لیے کس طرح تاکید فرمائی ہے ۔ سورہ آل عمران (۱۰۲-۱۰۵) میں ارشاد ہے: **یایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون ٥** .... (ترجمہ) " اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے کسی اور حالت پر جان مت دینا اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کی رسی کو اس طور پر کہ باہم سب متفق رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو اور تم پر اللہ تعالیٰ کا جو انعام ہے اس کو یاد کرو ۔ جب کہ تم آپس میں دشمن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی ۔ سو تم اللہ تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے

کنارے پر تھے، سو اس سے اللہ تعالیٰ نے تمھاری جان بچائی ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتا رہتا ہے، تاکہ تم لوگ ہدایت پاؤ اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلاتی رہے اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے باہمی تفریق کر لی اور باہم اختلاف کیا، جب کہ ان کے پاس واضح احکام پہنچ چکے تھے اور ایسے لوگوں کے لیے سخت عذاب ہوگا"

اسی سورۃ میں آگے ارشاد ہوتا ہے کہ:

"تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے ۔ تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آئے ہیں تو ان کے لیے اسی میں خیر ہے ۔ ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں اور زیادہ تر ان میں سے فاسق ہیں ۔ وہ تم کو ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، مگر کچھ تھوڑا اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو تم کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، پھر کسی طرف سے ان کی حمایت بھی نہ کی جائے گی" ۔

اللہ نے کھول کھول کر بتا دیا ہے کہ ہماری جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دیتی رہے اور برے کاموں سے روکتی رہے ۔ یعنی جب ہمارا مقصد خیر ہوگا اور بری باتوں سے روکنا ہمارا اشعار ہوگا تو یقیناً ہمارے اندر ایک ایسی قوت پیدا ہو جائے گی جس کا مقابلہ دیگر اقوام کے لیے نہایت دشوار ہوگا اور جب بھی ایسا موقعہ آئے گا، وہ پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے اور ان کی کسی طرف سے حمایت نہ کی جائے گی ۔ اس واضح خوش خبری کے بعد اہل ایمان کے لیے فتح و نصرت سے متعلق کون سا شک و شبہ رہ جاتا ہے اور ان کی قوت و غلبہ کے لیے کیا تامل باقی رہتا ہے؟

اللہ کا کتنا عظیم احسان ہے کہ آج ہماری ملت کسی بھی نسلی، وطنی، علاقائی اور

طبقاتی تقسیم کی روادار نہیں۔ تمام مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، پس وہ نہ اس سے خیانت کرتا ہے، نہ جھوٹ بولتا ہے اور نہ اسے رسوا کرنا چاہتا ہے۔ کسی کو جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی اعانت اور اس کی خدمت کو چھوڑ دے یا اس کو رسوا کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام مسلمان ایک جسدِ انسانی جیسے ہیں، یعنی جس طرح ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا جسم متاثر اور رنجور ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف سے تمام عالم اسلام تکلیف محسوس کرتا ہے۔ پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ سوتی نہیں، اسی طرح ایک مسلمان کی اذیت پوری قوم کی اذیت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط روح اور حیات ہے، یعنی اگر جسم میں جان ہے تو یہ احساس یقیناً پیدا ہوگا اور اگر جسم ہی مردہ ہے تو ظاہر ہے کہ کسی عضو کی تکلیف دوسرا عضو یا پورا بدن کیوں کر محسوس کر سکے گا؟ ٹھیک اسی طرح عالم اسلام کی روح اسلام اور ایمان ہے۔ اگر یہ روح موجود ہے تو عالم اسلام کے ہر فرد کو احساس ہوگا اور ہر فرد دوسرے کی تکلیف کو خود اپنی تکلیف سمجھے گا. کیوں کہ وہ صرف ایک ملت ہے اور ایک ہی ایمانی جسد ہے، خواہ اس کے افراد کہیں سے تعلق رکھتے ہوں۔ جنگ یرموک کا ایک سبق آموز واقعہ یہ ہے کہ جو حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ اس جنگ میں میرا بھائی سخت زخمی ہوا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور پیاس کی شدت سے بیتاب تھا۔ اس نے اشارہ کر کے مجھ سے پانی مانگا۔ میں پانی لے کر دوڑا تو اس کے پاس ہی دوسرا مسلمان زخمی پڑا ہوا تھا اور العطش العطش کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنے بھائی کے منہ میں پانی ڈالنا چاہا تو اس نے دوسرے مسلمان کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے اسے پانی پلاؤ۔ جب میں اس کے پاس پانی لے کر پہنچا تو اس دوسرے مسلمان نے تیسرے کی طرف اشارہ کیا کہ پہلے اسے دے دو، اسی طرح جب میں آخری مسلمان کے پاس پانی لے کر پہنچا تو اس کی روح پرواز کر چکی تھی، میں واپس ان پہلے زخمیوں کے پاس پہنچا تو

اس وقت تک سب کی روح پرواز کر چکی تھی۔ یہ تھا **انما المؤمنون اخوۃ** کا عملی نمونہ کہ نزع کی حالت میں بھی وہ ایک دوسرے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے برعکس آج ہم زندہ ہونے کے دعویدار ہونے کے باوجود دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب روشن ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی بندہ مومن نہیں بنتا یہاں تک کہ اپنے بھائی مسلمان کے لیے وہی بات پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، یعنی ایک مسلمان کے ایمان کی تکمیل میں اس بات پر انحصار رکھتی ہے کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے لیے وہی بات پسند کرتا ہے جو خود اپنے لیے پسند کرتا ہے اور اس کے لیے وہ بات ناپسند کرے جو خود اپنے لیے ناپسند کرتا ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرنے اور نہ کسی مصیبت میں اس کا ساتھ چھوڑے اور جو کوئی اپنے بھائی بھائی مسلمان کی حاجت روائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی کوئی سختی دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی سختی دور کرے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔

ایک اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ آدمی کے لیے یہ شر کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔ مسلمان کی ساری چیزیں دوسرے مسلمان پر حرام ہیں، اس کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو۔ یعنی نہ اس کی جان کو تکلیف دینا جائز ہے اور نہ اس کے مال کو نقصان کرنا اور نہ اس کی آبرو کو کوئی صدمہ پہنچانا۔ ایک جگہ رحمتہ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بھی بشارت دی کہ "جو شخص میری امت میں سے کسی کی حاجت پوری کرے صرف اس نیت سے کہ وہ خوش ہو تو گویا اس نے مجھے مسرور کیا اور جس نے مجھے خوش کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کر لے گا۔ اتحادِ ملت کے قیام اور اس کی بقا کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں

جن کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے ۔ مثلاً ایک مسلمان کو بلاوجہ برا بھلا کہنا بھی گناہِ عظیم ہے اور اس سے بلاوجہ لڑنا کفر ہے ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ چغل خوری نہ کرے اور دورویہ نہ بنے، یعنی ان کے منہ پر ان جیسا اور ان کے منہ پر ان جیسا ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے، اس عیب سے بے شمار عیوب کی پرورش ہوتی ہے اور آپس میں سخت نفرت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ بھی لازمی ہے کہ کسی مسلمان کی تکلیف سے خوش نہ ہو، کیا بعید ہے کہ اللہ اس پر رحم فرما دے اور اس کی تکلیف پر خوش ہونے والے کو اسی تکلیف میں مبتلا کر دے ۔ یہ بھی ضروری امر ہے کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کی عیب پوشی کرے ۔

غور کیجیے ہمارے معاشرے کی اصلاح اور ہمارے باہمی اتحاد و اتفاق کے لیے کیسا اچھا نظام قائم کیا گیا ہے، جس کے بغیر سکون نصیب نہیں ہو سکتا ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن الفت کا محل ہے"، یعنی مومن محبت کا مجسمہ اور الفت کا سرچشمہ ہے ۔ اس سے صرف خیر اور الفت ہی کی توقع کی جاتی ہے، نفرت اور شر اس کے خمیر میں نہیں، عیب اور عیب جوئی اس کا کردار نہیں، غیبت اور چغلی اس کی گفتار نہیں ۔ اگر اس طرح کا صحیح مومن ہماری قوم کا فرد ہو تو ہماری قوم کی کامیابی یقینی ہے ۔

نماز کے معاشرتی فوائد

صلوٰۃ (نماز) کے معنی دعا کے ہیں، لیکن وہ ایک ایسی دعا ہے جس کے ذریعے بندہ اپنے معبود کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کا اظہار کرتا ہے اور اپنے عجز وانکسار کا اقرار بھی کرتا ہے۔ اپنا دل، زبان اور ہاتھ، پاؤں تمام اعضا کو بارگاہِ الہیٰ میں عاجزی کے ساتھ جھکا دینا اور غیر اللہ سے رشتہ توڑ کر صرف اللہ سے رشتہ جوڑنا، اس صلوٰۃ اور دعا کا مقصد ہے اور یہ ایسا فریضہ ہے جو امیر و غریب، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، بیمار، تندرست، سب ہی پر یکساں لازم آتا ہے۔

معاشرہ عبارت ہے فرد اور جماعت دونوں سے اور بغیر فرد کی اصلاح کے جماعت کی اصلاح کبھی ممکن نہیں۔ چناں چہ اسلام کے تمام ارکان فرد اور جماعت دونوں کے فائدے کے لیے ہیں اور دونوں کے فائدے ہی سے معاشرہ اصلاح پذیر ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک افراد کی اصلاح نہیں ہوتی، جماعت بے معنی ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے بار بار افراد کی اصلاح پر زور دیا ہے اور فرد ہی کو اس (سورہ عنکبوت) میں خطاب ہے کہ "اور نماز کھڑی کیا کر"۔ بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔ اگر ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن ہم سے بے حیائی اور برائی دور نہیں ہوتی تو سمجھنا چاہیے کہ ہماری نماز ہی نہیں ہوئی، اگر ہوتی تو ہماری برائیاں ضرور دور ہو جاتیں۔ اس لیے کوشش ہونی چاہیے کہ ہم صحیح معنی میں نماز پڑھیں، اس کے صحیح طریقے سیکھیں اور اس کے صحیح فائدے حاصل کریں۔ اس صحیح قسم کی نماز کے متعلق سورہ اعلیٰ میں ہے کہ "کامیاب ہوا وہ جس نے (دل کی)

صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا۔ پس نماز پڑھی " یعنی مزکی اور مطہر (ظاہری اور باطنی دونوں طریقے سے) ہونا نماز کا ثمرہ ہے ۔ یہی وہ چیز ہے کہ جو کسی انعام کے حصول پر ادا کی جاتی ہے ۔ جیسے سورہ۔ کوثر میں ہے کہ " اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ہے، پس اللہ کی صلوٰۃ ادا کیجیے اور قربانی دیجیے " ۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے اللہ پاک سے استعانت کی جاتی ہے ۔ جیسے سورہ۔ بقرہ میں ہے کہ " اے ایمان والو! اللہ سے استعانت کرو، ساتھ صبر اور صلوٰۃ کے " ۔

ایسے نمازیوں کے متعلق سورہ۔ معراج میں ہے کہ بے شک انسان بے صبرا بنایا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل ہوا، لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں، یعنی صحیح نمازی وہ ہے جو بے صبرا بھی نہیں اور جو دولت ملنے پر بخیل بھی نہیں ہوتا ۔ مصیبت اور پریشانی میں صبر اور صلوٰۃ جس طرح مفید ہے اور ان دونوں خوبیوں کے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ فرد اور جماعت دونوں کے لیے مفید ہیں ۔ فرد بھی سکون حاصل کر سکتا ہے اور جماعت کو بھی دل جمعی اور استقامت حاصل ہوتی ہے، جو معاشرے کے استحکام کے لیے جزو اعظم ہے ۔ ظاہری تزکیہ اور طہارت کے لیے **وثیابک فطہر** (اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ) ایک فرد ہی کے لیے حکم ہے، جس سے ایک ایسی جماعت تیار ہوتی ہے جو مطہر ہوتی ہے ۔ سورہ۔ توبہ میں ہے اس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ پاک صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے ۔ تزکیہ اور طہارت لازم و ملزوم چیزیں ہیں، یعنی جب انسان پوری طرح اپنے جسم کو پاک صاف رکھتا ہے تو اس کے خیالات میں بھی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور اس پاکیزگی کی وجہ سے اس کا قلب مزکی ہو جاتا ہے، جو ہمیشہ خیر و فلاح کے لیے آمادہ کرتا ہے اور برائیوں سے پرہیز کراتا ہے ۔

تزکیہ اور طہارت کے علاوہ انسانی تربیت کے لیے نماز میں پابندی وقت کی

مشق بھی ہے، تاکہ وہ محسوس کرے کہ وقت کی اہمیت کس قدر ہے۔ سورہ۔ النسا میں ہے کہ "بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے"۔ یہ مقرہ اوقات انسانی نظام حیات کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اگر نماز کے لیے مسلمان اپنا وقت نکالتا ہے تو بقیہ وقت وہ اپنے دوسرے کاموں کے لیے وقف کر سکتا ہے اور اس کے عملی پروگرام میں یکسوئی اور پابندی پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ پابندی اس کے لیے از بس ضروری ہے اور اس کے بغیر وہ اپنے لیے کوئی لائحہ۔ عمل تیار نہیں کر سکتا۔ چناں چہ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنے وقت کی قدر کرتی ہیں اور اپنا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ مسلمانوں کے لیے وقت پر سونا، وقت پر اٹھنا اور وقت پر اپنے کام کرنا فرض بن جاتا ہے۔ گویا وقت کو ضائع کرنا یا وقت کی ناقدری کرنا اس کے لیے گناہ ہے، اور وہ اللہ کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔

نماز ایک قسم کی ورزش بھی ہے اور بہت ممکن ہے کہ مختلف قوموں میں جو ورزشیں رائج ہیں وہ اسلام کی نماز ہی کی دوسری صورتیں ہیں، تہجد وغیرہ۔ انفرادی نمازوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا طویل قیام، طویل رکوع اور طویل سجدہ بہت سی ورزشوں کا نعم البدل ہے۔ دل کے امراض کے جدید ترین ماہرین یہی مشورہ دیتے ہیں کہ سیدھے قیام کے بعد دیر تک زمین پر سر رکھا جائے، یعنی وہ نماز اور سجدہ کا ذکر نہیں کرتے لیکن عمل اسی کا کراتے ہیں۔ اللہ کے آگے فرد یا جماعت کا جھکنا اور ایک ہی وقت میں جمع ہو کر ایک ہی سردار کے حکم سے قیام، رکوع، قومہ، سجدہ اور جلسہ وغیرہ ایک ساتھ کرنا صف بندی بھی ہے، امام کی اطاعت بھی ہے، محبت اور یگانگت کا مظاہرہ بھی ہے۔ غلام اور آقا کے امتیاز کو ختم کر کے صحیح مساوات پر عمل بھی ہے اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت کی تشکیل اور تعمیر بھی ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

یعنی جہاں آقا اور بندہ نواز کا سر رکھا جاتا ہے وہیں غلام اپنے قدم رکھتا ہے۔ مساوات اور یگانگت کی یہ چیز کسی قوم میں نظر نہیں آتی اور یقیناً یہ چیز مسلمانوں کی امتیازی شان ہے۔

مسلمانوں کے اجتماعی نظام کو مستحکم کرنے کے لیے نماز سب سے اہم رکن ہے۔ محلے کی مسجد میں پانچ وقت سب مسلمانوں کا جمع ہونا گو کہ نماز کے لیے ہے، لیکن آپس کے میل جول، ہمدردی اور غم خواری کے لیے کتنا آسان ذریعہ ہے۔ جب وہ پانچ وقت ملیں گے تو یقیناً ایک دوسرے کی خیریت دریافت کریں گے، آپس میں محبت پیدا ہو گی اور باہمی خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ پھر نماز جمعہ میں شہر کے لوگ یا بڑے مجمع کے لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو یقیناً محبت اور یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ عیدین کی نمازوں میں دور دور کے لوگ او قرب وجوار کے دیہات کے لوگ بھی عیدگاہ میں جمع ہوتے ہیں تو ان کے درمیان اخلاص اور رافت کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے پھر حج کے موقع پر تمام عالم کے مسلمانوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا تمام بیگانگی اور مختلف امتیازات کو ختم کر دیتا ہے اور غم گساری، غم خواری، مساوات، مواخات، الفت اور شفقت کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اجتماعی نظام کے لیے ایسا عمدہ نمونہ کسی اور قوم کے تصور میں بھی نہیں ہے۔ سورہ روم میں ہے " اور اللہ سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، ان میں سے جنھوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے "۔ اس آیہ شریفہ سے یہ بات واضح ہے کہ نماز مشرکوں اور شرک سے بچاتی ہے اور پھوٹ ڈالنے سے روکتی ہے۔ یہ دونوں باتیں ہماری مسجدوں اور حرمین شریفین کے اجتماعات کی وجہ سے یقیناً ختم ہو جاتی ہیں۔ نماز والوں کا شرک سے کیا واسطہ؟ لیکن ان اجتماعات کی وجہ سے آپس میں جو محبت اور یگانگت پیدا ہوتی ہے اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

نمازیوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ۔ سورہ. بقرہ کے شروع ہی میں ہے کہ "اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں " ۔ یہ آیت دراصل متقین کے سلسلے میں ہے، جن میں نمازی ہیں اور وہ محض اللہ کی رضا کے لیے اور آپس میں ہمدردی کی خاطر اپنے حلال مال میں خرچ کرتے ہیں ۔ یہ خرچ جب اللہ کی خوشنودی کے لیے ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی اور غرض وابستہ نہیں ہوتی تو پھر وہ آپس کی محبت، خلوص اور غم خواری کا ذریعہ بن جاتا ہے ۔ ہماری اجتماعی زندگی کو استوار کرنے کے لیے یہ خرچ کس قدر ضروری ہے ؟ زکوۃ، خیرات وغیرہ کا جو مصرف اور مسلمانوں کے یہاں ہے اس سے دوسری قومیں بالکل محروم ہیں، اسی لیے وہ نت نئے ٹیکس لگا کر آپس میں محبت تو نہیں انتشار اور اختلاف پیدا کرتی ہیں اور اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتی ہیں ۔ نماز کی وجہ سے انسانی دل و دماغ کی بھی اعلیٰ تربیت ہوتی ہے ۔ اگر ایک شخص ایک کام کو شروع کر کے اس پر عمر بھر کاربند رہے اور اپنے اخلاق کو ایک نہج پر (محض رضائے الہیٰ کے لیے) قائم رکھے تو اسی چیز کو عادات کی استواری اور کردار کی مضبوطی کہا جاتا ہے ۔

اجتماعی تربیت کے لیے نماز ایک اور اہم پروگرام پیش کرتی ہے ۔ یہ قرآنی پیغام کی اشاعت ہے ۔ یعنی بغیر قرآن کی تلاوت کے کوئی نماز، نماز نہیں ہے اور قرآن وہ پروگرام ہے جس کے بغیر مسلم معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا ۔ قرآن پاک کی تلاوت کسی مقام سے کی جائے، مسلمان کے لیے لائحہ عمل بن جاتی ہے اور وہی مسلمانوں کی زندگی کے لیے سب سے اہم رہبر ہے اور اسی کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے عنایت فرمایا ہے ۔ قرآن پاک کی عام تلاوت کے علاوہ نماز میں ایک خاص تلاوت سورہ. فاتحہ کی ہے، جس کے بغیر کوئی نماز اور کوئی رکعت نہیں ہو سکتی ۔ یہ سورت اپنی جامعیت کے لحاظ سے قرآن پاک کا ایک خلاصہ ہے اور اس میں اللہ پاک کی نو صفات بیان کی گئی ہیں:

(۱) وہ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے (خواہ کوئی اسے جانے اور مانے خواہ نہیں)۔

(۲) وہ رحمن ہے۔ یہ لفظ بطور علم مستعمل ہوا ہے۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ "رحمن وہ ہے کہ جب اس سے مانگا جائے تو وہ عطا فرمائے" اور

(۳) رحیم وہ ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو وہ غضب میں آئے۔

(۴) یوم دین کا مالک ہے۔

(۵) وہی عبادت کے لائق ہے۔

(۶) وہی مدد فرماتا ہے۔

(۷) وہی صراط مستقیم کے لیے ہدایت فرماتا ہے۔

(۸) اس میں غضب کی صفت بھی ہے۔

(۹) اور وہ راہِ راست سے ہٹانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

اللہ کی ان صفات کا بار بار اعادہ ہماری اجتماعی زندگی کو کس قدر استوار کر سکتا ہے اور ایسے تصور سے ہمارے اذہان میں کس قدر عظیم اور قادر ذات کا یقین قائم ہوتا ہے۔

کیا ایسے اللہ پر یقین رکھنے والی قوم کسی اور قوم یا کسی اور طاقت کے آگے جھک سکتی ہے

واللہ یحکم لا معقب لحکمہ

اور اللہ حکم دیتا ہے، اس کے حکم کو ٹالنے والا کوئی نہیں۔

دعا کی حقیقت اور اہمیت

عربی میں دعا کے معنی پکارنا، بلانا، سوال کرنا اور مانگنا کے ہیں ۔ اللہ پاک نے اپنی رحمتِ کاملہ کے صدقے میں مختلف طریقوں سے ہم کو دعا کرنا سکھایا ہے ۔ مثلاً صرف ربنا سے شروع ہونے والی دعائیں ۱۱۰ آیات میں ہیں، جن کا تعلق ہر زمانے سے ہے اور ان سے بندے کی عاجزی، انکساری اور حاجت طلبی مقصود ہے ۔ خود " رب " کے لفظ میں بڑی کشش ہے اور اس کے معنی وہ ذاتِ باری ہے جو ہر چیز کو جب اس نے پیدا کیا ہے کمال کی حد تک پہنچا دیتی ہے ۔ اسی لیے اس سے مانگنا اور اس کے سامنے گڑ گڑانا ہی سودمند ہو سکتا ہے ۔

جب وہ ہر چیز کو اس کے کمال کی حد تک پہنچا دیتا ہے تو اپنے عاجز اور مسکین سائل کو کیوں رد فرمائے گا اور اسے وہ کیوں نہ شرفِ قبولیت بخشے گا، جب کہ وہ وعدہ فرماتا ہے کہ " تم مجھے پکارو، میں تمھاری دعا قبول کرنے والا ہوں " ۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی ہم اس سے مانگتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں یا نہیں ؟ عموماً ہماری دعاؤں کی نوعیت یہ ہے کہ چند رٹی ہوئی دعائیں گنگنا کر پڑھتے جاتے ہیں اور ہر شخص کا منہ تکتے رہتے ہیں اور دیکھتے جاتے ہیں اور آمین کہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ایسی دعا دعا تو نہ ہوئی ۔ یہ دعا ہم نے پڑھ لی اور اس پر آمین بھی کہہ دی گئی، لیکن نہ تو اللہ کے سامنے پیش کی گئی اور نہ صحیح طور پر بارگاہِ الہیٰ میں التجا کی سہ چناں چہ ایسی دعا کا نتیجہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ البتہ وہ دعائیں جو بارگاہِ الہیٰ میں خلوص دل اور خشوع و خضوع سے پیش کی جاتی ہیں وہ حقیقت میں دعائیں ہوتی ہیں اور ضرور

انھیں شرف قبول حاصل ہوتا ہے۔

سورہ۔ المومن میں **ادعونی استجب لکم** (یعنی تم مجھے پکارو میں تمھاری درخواست قبول کروں گا) کی شرح میں بھی یہی بات آتی کہ اپنی تمام حاجتوں کے لیے اللہ پاک ہی کو پکارنا چاہیے اور اس پکارنے میں صرف اسی کی عبادت اور اسی کی رضا جوئی مقصود ہونا چاہیے"۔

سورہ۔ مائدہ میں **انما یتقبل اللہ من المتقین** سے بھی یہی مقصد ہے کہ اللہ پاک متقیوں اور اس سے ڈرنے والوں ہی کا عمل قبول فرماتا ہے۔ یعنی اگر ہم اس کی بارگاہ میں عاجزی اور انکساری سے اپنی درخواست پیش نہ کریں گے تو کس طرح ہمارے کام بن سکتے ہیں؟ حجتہ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ وہ دعائیں جن کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے دو قسم کی ہیں؛

ایک تو وہ دعائیں ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ قویٰ فکریہ، جلال الٰہیٰ اور اس کی عظمت کے ملاحظے سے پر ہو جائیں یا خضوع اور فرمانبرداری کی حالت حاصل ہو، کیوں کہ زبان سے اس چیز کو جو اس حالت کے مناسب ہے، زبان سے بیان کرنے میں نفس کو متوجہ کرنے کے لیے بڑا اثر ہے۔

اور دوسری قسم کی وہ دعائیں ہیں جن میں دنیا اور آخرت کی بھلائی کی طرف رغبت مقصود ہوتی ہے اور ان کی برائی سے پناہ مانگی جاتی ہے۔ کیوں کہ نفس کا ارادہ اور ہمت کوشش سے اس کا کسی چیز کا طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے "وجود" کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے۔ دل کو کیفیت دینے والی حاجت انسان کو مناجات کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور اللہ پاک کی عظمت کو اس کے روبرو پیش کر دیتی ہے اور ایسے وقت میں آدمی کی ہمت اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ پس یہ حالت نیک آدمی کے لیے بہت غنیمت ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دعا عبادت ہی ہے"۔

پھر شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ

دعا عبادت ہی ہے، تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اصل عبادت تعظیم کی صفت کے ساتھ اللہ کے حضور میں مستغرق ہو جانا ہے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ بہترین عبادت کشادگی کا انتظار کرنا ہے۔

اس کی شرح میں شاہ صاحب فرماتے ہیں، نزول رحمت کے طلب کرنے میں رغبت کے ساتھ امید کرنا جس قدر موثر ہے، اس قدر عبادت کرنا بھی موثر نہیں ہے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث آتی ہے کہ "جو شخص اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتا ہے تو اللہ پاک اسے عطا فرما دیتا ہے یا اس کے برابر مصیبت کی برائی اس سے روک دیتا ہے"۔ شاہ صاحب نے اس کی شرح میں فرمایا ہے کہ اشیاء کے لیے عالم مثال سے زمین پر ظاہر ہونے کا ایک تو طبعی طریقہ ہے، اگر چیز خارج سے مانع نہ ہو۔ اور ایک غیر طبعی طریقہ ہے، اگر اسباب میں مزاحمت پائی جائے۔ پس غیر طبعی کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی مصیبت کے رفع کرنے کی یا اس کی وحشت دور کرنے کی طرف اور اس کے دل میں خوشی کو القا کرنے کی طرف یا اس حادثے کو اس کی جان سے ٹال کر اس کے مال کی طرف مائل کرنے کے لیے رحمتِ الٰہیٰ متوجہ ہوتی ہے اور اس قسم کی اور صورتیں بھی ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے، اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر اور اگر تو چاہے تو مجھ کو رزق دے، بلکہ کوشش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کرے کیوں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اس پر کسی کا دباؤ نہیں ہے۔ اس حدیث کی شرح میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ دعا کی روح اور اسؓ کا بھید نفس کا کسی چیز میں رغبت کرنا ہے اور شک کے ساتھ طلب کرنا ارادے کے اندر پراگندگی پیدا کرنا ہے۔ ہمارے دوسرے علماء نے بھی دعا کی اہمیت پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ہر کام اور ہر مصیبت میں اسی طرح جو اپنے کرنے کی تدبیر ہے وہ بھی کرے اور سب تدبیروں کے ساتھ اللہ

تعالیٰ سے خوب عاجزی اور توجہ کے ساتھ عرض کرتا رہے اور جس کام میں تدبیر کا کچھ دخل نہیں اس میں تمام کوشش دعا ہی میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ جیسے بارش کا ہونا یا اولاد کا زندہ رہنا یا کسی بیمار کا لاعلاج مرض سے اچھا ہوجانا یا نفس اور شیطان کے شر سے بچنا اور وبا وغیرہ سے محفوظ رہنا یا قابو حاصل کیے ہوئے ظالموں سے بچنا وغیرہ۔ ایسے کاموں کا بنانے والا صرف اللہ ہی ہے اور صرف دعا ہی سے اللہ پاک کا فضل حاصل ہوسکتا ہے۔ دعا کی حقیقت اللہ کے دربار میں اپنی درخواست پیش کرنا ہے۔ اس درخواست کے وقت آنکھیں، دل و دماغ ہمہ تن اسی کی طرف ہونا چاہییں۔ ایک معمولی حاکم کے سامنے کچھ عرض کرنا ہوتا ہے تو کس قدر ادب اور عاجزی سے عرض کیا جاتا ہے۔ پھر اگر وہ حاکم اس کی درخواست کو منظور نہ کرے اور افسوس ظاہر کرے تو عرض کرنے والا فوراً جواب دیتا ہے کہ حضور مجھے کوئی رنج یا شکایت نہیں، پھر دیکھا جائے گا۔ غرض دنیوی حکام کے سامنے ہمارا حال یہ ہوتا ہے، لیکن احکم الحاکمین کے سامنے اگر ہم ذرا بھی ہمہ تن ہوکر ادب اور عاجزی سے عرض نہ کریں تو کیوں کر حسن قبول حاصل ہوسکتا ہے؟ پھر جب اللہ پاک کا وعدہ ہے کہ وہ سنے گا تو سنانے والا اور پیش کرنے والا بھی تو کوئی ہو۔

سورہ۔ النمل میں ہے کہ "یا وہ ذات جو بے قرار آدمی کی سنتا ہے، جب وہ اس کو پکارتا ہے اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے اور تم کو زمین میں صاحبِ تصرف بناتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی معبود ہے؟ تم لوگ بہت کم یاد رکھتے ہو"۔ اور اس آیتِ مبارکہ میں پھر اشارہ ہے کہ اس کو پکارنے کے طریقے سے پکارو۔ یعنی جب انسان بے قرار ہوتا ہے اور اپنی مصیبت سے پریشان ہوکر خلوص دل سے اس کو پکارتا ہے تو وہ ضرور سنتا ہے اور مصیبت کو دور کرتا ہے۔ اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ایسے موقع پر وہی یاد آتا ہے اور انسان مجبور ہوکر اس معبود کے آگے سر رکھ دیتا ہے کہ اسی عاجزی میں اس کے لیے سعادت ہے۔ سورہ۔ شعرا۔ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کے ساتھ جو

دعائیں ہیں، ان میں کس قدر خشیت ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ "رب العلمین ! وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے اور جو مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے اور جو مجھ کو موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا اور جس سے مجھے یہ امید ہے کہ میری غلط کاریوں کو قیامت کے روز معاف کر دے گا اے میرے پروردگار! مجھ کو حکمت عطا فرما اور مجھ کو جنت النعیم کے مستحقین میں سے بنا دے اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما دے کہ وہ گمراہوں میں سے ہیں"۔

ابراہیم علیہ السلام کی ان دعاؤں سے اندازہ ہو گا کہ وہ کس پیارے انداز سے اللہ کو پکارتے ہیں اور کس قدر عاجزی کے ساتھ عرض کرتے ہیں ۔ ان کی قبولیت کا اندازہ اسی امر سے ہو سکتا ہے کہ ان کا ذکر ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا ہے اور غیر ذی زرع وادی کی آواز قیامت تک گونجتی رہے گی ۔ اسی طرح سورہ۔ الانبیا میں زکریا علیہ السلام کی دعا آتی ہے ۔ اس آیت میں بھی کس قدر خشیت اور کتنا خضوع ہے ۔ اللہ پاک نے پھر ان کی دعا بھی قبول فرمائی اور ان کو یحییٰ علیہ السلام جیسا فرزند عطا فرمایا ۔ پھر اس دعا کی حقیقت اور اہمیت کو بھی اس موقعہ پر بیان فرما دیا کہ یہ سب نیک کاموں کی طرف دوڑتے تھے اور امید و بیم کے ساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی اور فروتنی اختیار کرتے تھے ۔ گویا دعا کی تین حقیقتیں ہیں کہ؛

(۱) وہ نیک کاموں کی طرف مائل کر دے ۔

(۲) امید و بیم کے ساتھ اللہ کی یاد میں مصروف کر دے ۔

(۳) اللہ کے آگے عاجزی اور فروتنی بھی سکھائے ۔ جب دعا کی یہ حقیقت حاصل ہو جائے تو یقیناً دینی و دنیوی حسنات اور بھلائیاں حاصل ہوں گی ۔ پھر سب سے زیادہ مقبول دعا تو سورہ۔ الفاتحہ کی ہے، جس میں اللہ پاک کی حمد و ثنا کے بعد اس کے سامنے اپنی عاجزی پیش کر کے اس سے استعانت کی جاتی ہے اور نیکوں کی صراط مستقیم کے لیے ہدایت طلب کی جاتی ہے ۔ آخر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد

گرامی کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ فرمایا کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو کوئی دعا کرے جس میں گناہ اور قطع رحم نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ اس دعا کے سبب اس کو تین چیزوں میں سے ایک ضرور دیتا ہے:

(۱) یا تو فی الحال وہی مانگی ہوئی چیز دے دیتا ہے۔

(۲) یا اس کو آخرت کے لیے ذخیرہ کر دیتا ہے۔

(۳) یا کوئی ایسی ہی برائی اس سے ہٹا دیتا ہے۔ بہرحال یہ بات صحیح ہے کہ جب تک دل میں تمنا نہ ہو دعا، دعا نہیں ہے۔ بقول اقبال؛

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام

معاشرہ عبارت ہے ان تمام چیزوں سے جن کا تعلق انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہوا کرتا ہے اور اس معاشرے کی اصلاح و خیر کے لیے ہی حقوق و فرائض کی ضرورت پیش ہوتی ہے۔ جن مذاہب میں گوشہ نشینی اور تجرد پسندی کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھا گیا، وہ تخلیق انسانی کی غرض و غایت ہی کو نہ سمجھے اور انھوں نے خود انسانیت اور اس کی بقا کے خلاف محاذ قائم کیا۔یہی وجہ ہے کہ وہ مظلوم رہی۔ حالاں کہ عورت جو بیٹی بھی ہوتی ہے، بہن بھی، ماں، نانی اور دادی بھی ہو جاتی ہے، اسے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے متعدد منازل پر متعدد حقوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور ان ہی حقوق کی نگہ داشت سے ایک صالح معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ جن حضرات نے قانون قدیم (Ancient Law) اور قانون روما (Roman Law) کا مطالعہ کیا ہے انھیں معلوم ہے کہ عورت ایک ایسی بے مایہ جنس تھی جو قرض کے بدلے میں بھی دی جا سکتی تھی اور ایسی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں رکھی جاتی تھی کہ اس کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔اس کی مظلومیت کی داستان اگر دہرائی جائے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل لرزنے لگتا ہے۔ تجرد اور زاویہ نشینی کے نام پر عورت کے وجود کو ایک عضو معطل قرار دے دیا گیا، جس کی وجہ سے خود تخلیق آدم کا مقصد فوت ہو جاتا تھا اور معاشرے میں باہمی حقوق و فرائض کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی تھی۔

اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ماں، باپ، اولاد اور زوجین کے حقوق کو قائم

کیا اور انسانیت کو اس کی بقا اور اس کی فلاح کے اسرار دکھائے، ورنہ جس معاشرے میں بیٹی زندہ دفن کی جاتی ہو، بہن حیوانات کی طرح اپنے بھائی اور اپنے حقیقی باپ کی بیوی بن سکتی ہو، وہ معاشرہ کیوں کر انسان اور انسانیت کے لیے صحیح ہو سکتا ہے؟

اسلام نے اس معاشرے کی فلاح و خیر اور مرد و عورت کی تخلیق سے متعلق فرمایا کہ "اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ رکھو، اللہ تعالیٰ تمھاری دیکھ بھال کر رہا ہے"۔

سورہ روم میں بھی ہے کہ "اور اس اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمھاری جنس سے تمھاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمھارے درمیان پیار اور محبت کو پیدا کیا، بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں"۔ یعنی معاشرے کی فلاح ہی اس بات میں ہے کہ سب سے پہلے اپنی انفرادی زندگی کو پیار اور محبت سے تشکیل دیا جائے، تاکہ سکون اور اطمینان میسر ہو اور اس سکون کے حصول کے لیے اسلام نے حقوق و فرائض مقرر کر دیے، تاکہ اعتدال قائم رہے اور زندگی خوشیوں سے بھرپور ہو۔ اور جو لوگ ایسی برکتوں والی ازدواجی زندگی کے خلاف ہیں، وہ اسلام والوں میں سے نہیں ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو ہم نے بار بار سنا ہے کہ "نکاح میری سنت ہے، تو جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں ہے"۔ گویا ازدواجی زندگی کا منکر کسی اور مذہب کا ہو سکتا ہے لیکن اسلام والا نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ رشتہ ایسا ہی ہے کہ اگر باہمی حقوق کا لحاظ رکھا جائے تو شخصی زندگی جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے کہ عورتیں تمھارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ یعنی اسلام یہ چاہتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے

کے ایسے رفیق بن جائیں کہ ان میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا گزارہ نہ ہو سکے۔ چناں چہ اس رفاقت اور موافقت میں جو لوگ پھوٹ ڈالتے ہیں ان کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ سورہ، بقرہ میں ہے کہ وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔ اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس باہمی میل جول اور رفاقت کو قائم رکھنے کے لیے اللہ پاک نے مرد اور عورت دونوں میں بعض خصوصی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ عورتیں دل جوئی، ہمدردی، ایثار اور محبت کی بڑی صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ مرد میں اس کی حفاظت کرنے اور اس کے مصارف کا بوجھ اٹھانے کی خاص صلاحیتیں ہیں۔ ان باہمی صلاحیتوں کو اگر بروئے کار لایا جائے تو ایک گھر کیوں کر جنت کا نمونہ نہ بنے گا۔

سورہ، نساء میں ارشاد ہے کہ "مرد، عورتوں کے سرپرست ہیں، اللہ پاک نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ مرد ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ پس نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور وہ غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ اللہ پاک نے ان کی حفاظت کی ہے"۔ گویا عورت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ اپنے مرد کی فرمانبردار رہے اور اس کے مال اور ملکیت کی پوری نگرانی رکھے اور اس کی عزت و آبرو کی جو خود اس کی عزت و آبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں حفاظت کرے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش رکھے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔

جاہلیت کے زمانے میں عربوں کا دستور تھا کہ مرد یہ قسم کھالیتے تھے کہ اب ہم اپنی بیویوں سے اچھا برتاؤ نہیں کریں گے۔ پھر اگر کوئی شخص ان کے درمیان صلح و صفائی کرانے کی کوشش کرتا تو وہ کہتے کہ ہم نے قسم کھالی ہے اس لیے ہم اب مجبور ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی قسموں کی سخت مخالفت کی۔

اور اللہ پاک نے سورہ، بقرہ میں اس طرح ارشاد فرمایا "اور اللہ کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ کہ تم سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ تو سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے " ۔ یعنی قسم کھا کر حسن سلوک کو پس پشت ڈال دینا بھی نہایت معیوب ہے ۔

اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا کہ " تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہو " ۔ یعنی انسان کے بہتر ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ پہلے اپنوں کے لیے بہتر بن جائے ۔ جو شخص اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسرے کے ساتھ کیا انصاف کر سکتا ہے ؟ نیکی کرنے اور انصاف کرنے کی مشق اور عادت سب سے پہلے اپنے گھر ہی سے شروع ہو سکتی ہے اور یہیں سے ایک صالح معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے ۔

ہو سکتا ہے کہ مرد کی طرح عورت میں بھی بعض خامیاں ہوں، لیکن دنیا میں کون ہے جو خامیوں سے خالی ہو ؟ ایک شخص میں اگر ہزار عیب ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ضرور ہوں گی، اسی طرح اگر بیوی میں کچھ خامیاں ہیں تو بعض خوبیاں بھی ایسی ہوں گی جو حقیقت میں قابل قدر ہوں گی ۔ سورہ، نساء میں فرمایا کہ " اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقے سے گزران کرو، اگر وہ تم کو نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور اللہ نے اس میں بہت سی خوبیاں رکھی ہوں " ۔ یہ خوبی اسی لیے ضرور ملے گی کہ وہ مرد کا لباس ہے اور مرد کو اس سے صحیح راحت اور دل جوئی حاصل ہو سکتی ہے ۔
کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو غریبی اور عسرت کی وجہ سے شادی نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ابھی گزارا نہیں ہو سکتا تو شادی کر کے کیا گزارا ہو سکے گا ۔ یہ خیال اور واہمہ بالکل غلط ہے ۔ اللہ پاک کا حکم ہے کہ " اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا بیوہ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہو گئے تو اللہ پاک ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے " (سورہ، نور) ۔ یعنی ازدواجی زندگی یقیناً خیر و برکت کا ذریعہ ہے

اور معاشرے کی بہت سی برائیوں کو ختم کرنے کا باعث ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی بیٹیوں کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں اور انھیں اپنے گھروں کی شہزادیاں سمجھتے ہیں، لیکن دوسرے کی بیٹی کو بیاہ کر لاتے ہیں تو اسے لونڈی سمجھتے ہیں اور (کافروں کی طرح) اسے پورے گھر کی خادمہ سمجھتے ہیں اور اگر اس کا شوہر اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو اسے زن مرید کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شوہر پر اس نے کچھ تعویذ وغیرہ کرا دیا ہے اور اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ کافروں کے یہ طور طریقے اور رواج ہمارے معاشرے کے بالکل منافی ہیں۔ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا ہے اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے: "اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا کہ مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک درجہ (ضرور) حاصل ہے"۔

اسی لیے شرع کا حکم ہے شوہر کے والدین سختی کرتے ہوں تو بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ الگ رہنے کا مطالبہ کرے اور شوہر پر واجب ہے کہ وہ اس مطالبے کو پورا کرے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں عورتوں کی دستگیری فرمائی ہے:

"لوگو عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمھارے ہاتھوں میں قید ہیں۔ تم سوائے اس بات کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام نہ کریں، اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو، اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو۔ بے شک تمھارا حق عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر ہے۔ تمھارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمھارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جس کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمھارے گھروں میں ان لوگوں کو اجازت دیں جن کا آنا تمھیں پسند نہیں اور ہاں ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو۔

اصحابِ رسولؐ کا ذکر قرآن پاک میں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت صحابہ۔ کرامؓ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی، جن میں مہاجرین ایک سو چودہ تھے اور جن صحابہ سے کتبِ حدیث میں روایات منقول ہیں ان کی تعداد ساڑھے سات ہزار تھی۔ ان تمام صحابہ کے متعلق عموماً اور خلفاء راشدین کے متعلق خصوصاً متعدد آیات ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یارِ غار ہونے کے بارے میں سورہ۔ توبہ کی چالیسویں آیت میں ہے "اگر تم ان کی (یعنی اللہ کے رسول کی) مدد نہ کرو گے تو (ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، کیا تم کو یاد نہیں کہ) اللہ نے ان کی اس وقت مدد فرمائی جب کہ ان کو کافروں نے (مکہ سے) نکالا تھا، جب کہ (رسولؐ) ان دو میں سے تھے (یعنی ایک تو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جب دونوں غار میں تھے جب وہ (رسولؐ) اپنے رفیق کو تسلی دے رہے تھے کہ غم نہ کرو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کی مدد (ملائکہ کی) ایسی فوجوں سے کی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور (اس طرح) اللہ نے کافروں کی بات کو نیچا کر دیا اور اللہ ہی کی بات اونچی ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے"۔

دوسری آیت سورہ۔ فتح کے آخر کی ہے، جس میں اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے اوصاف بیان فرمائے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ چاروں خلفاء راشدین کے فضائل ہیں کہ انھوں نے اسلام کے عروج اور فروغ کے لیے کیا کیا! اور ان کی مثال ایک کھیتی کی مانند ہے کہ اس نے پہلے سوئی کی طرح ایک پتی

نکالی، پھر اس کو مضبوط اور قوی کیا، پھر وہ اور موٹی ہوئی اور بڑھ کر اپنے بل پر کھڑی ہو گئی۔

تیسری آیت سورۃ الیل کی اس آیت سے شروع ہے کہ "وہ دور ہی رکھا جائے گا (دوزخ کی آگ سے) کہ وہ بڑا متقی ہے، جو اپنا مال و متاع تزکیہ کے لیے (سیرت کو سنوارنے کے لیے) دیتا ہے (اس کی سخاوت نام و نمود کے لیے نہیں ہے)"۔

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی تھی، جب کہ انھوں نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور پے در پے سات غلاموں کو، جو مسلمان ہو جانے کے سبب ستائے جاتے تھے، مول لے کر آزاد کیا۔

چوتھی آیت سورہ۔ النور کی بائیسویں ہے کہ "جو تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں وہ اپنے قرابت والوں کو دینے سے انکار نہ کریں"۔

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حق میں نازل ہوئی، جب کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگائی گئی اور قرآن پاک میں ان کی پاکی ظاہر کی گئی، تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مسطحؓ کو، جو ان کے قرابت دار تھے اور اس تہمت میں شریک تھے، دینا موقوف کر دیا تھا اور اس سے پہلے وہ ان کے ساتھ سلوک کیا کرتے تھے۔ آیت نازل ہونے کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو پھر دینا شروع کر دیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بزرگی والا فرمایا ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی کئی آیتیں ہیں۔ آیت اظہار دین **لیظھرہ علی الدین کلہ** قرآن پاک میں تین جگہ ہے، جس میں اللہ پاک نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہ مقصد بیان فرمایا ہے کہ دین برحق کو تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہو جائے اور یہ مقصد ظاہر ہے کہ اس وقت تک

حاصل نہیں ہو سکتا تھا، جب تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران اور روم کی دو زبردست سلطنتیں مسلمانوں کے قبضے میں نہ آئیں۔ سورہ فتح کی سولھویں آیت ہے کہ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)، جو بدو لوگ (حدیبیہ میں) آپؐ کے ہمراہ آگئے تھے ان سے فرما دیجیے کہ عنقریب بلانے والا تم کو ایک سخت جنگ آور قوم سے لڑنے کے لیے بلائے گا۔ اگر تم اس بلانے والے کی اطاعت کروگے تو بڑا ثواب پاؤ گے، ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا"۔ یہ پیش گوئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پوری ہوئی، جب انھوں نے ان بدوؤں کو بلایا اور جن کی اطاعت پر بڑا ثواب دینے اور جن سے بغاوت کرنے والوں کے لیے اللہ پاک نے عذاب الیم کی تہدید فرمائی۔ ان آیتوں کے علاوہ وہ آیتیں بھی ہیں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خواہش کی تائید میں نازل ہوئیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ کی خواہش تھی کہ ازواج مطہرات کو پردے کا حکم دیا جائے، چناں چہ ایسی آیت نازل ہوئی۔

آپؓ کی آرزو تھی کہ مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنایا جائے، شراب کے حرام کرنے کی بھی آپ کو بڑی آرزو تھی، پھر ویسی ہی آیت نازل ہوئی۔ منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے آپ روکتے تھے، چناں چہ سورہ توبہ میں ان لوگوں کی نماز نہ پڑھنے کا حکم نازل ہوا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں شامل ہیں، جن کی فضیلت عموماً اور مہاجرین و انصار کی فضیلت خصوصاً قرآن پاک میں بیان کی گئی ہے۔ نیز آیت اظہار دین جس میں فارس اور روم کی فتح کی پیش گوئی ہے اور جس سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ثابت ہے اور اس فضیلت میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حصہ بھی ہے، کیوں کہ ان سلطنتوں کی فتح کا تکملہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ یعنی وہ آیات جو مہاجرین کی تعریف میں ہیں اور جن میں ان کا مستحق خلافت ہونا بیان فرمایا

ہے ۔ ان سب آیات سے آپ کے فضائل ثابت ہوتے ہیں، کیوں کہ آپ کا شما
سابقین مہاجرین میں ہے اور ایسے سابقین کی فضیلت اور ان کے درجات کی بلندی ک
ذکر سورہ۔ توبہ میں ہے کہ " اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور (اللہ
نے) ان کے واسطے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں وہ
ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے " ۔ مہاجرین اولین کے متعلق سورہ۔ نور میں
جو فضائل بیان کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ " یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں جگہ
دیں گے تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور برائی
سے روکیں گے " ۔ ان ہی لوگوں کے متعلق سورہ۔ نور میں یہ بھی ہے کہ " تم میں سے
جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین کا
خلیفہ بنائے گا، جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنا چکا ہے جو ان سے پہلے تھے اور ان کے اس
دین کو جو ان کے لیے پسند کیا ہے، مضبوط کر دے گا " ۔ مہاجرین اول، اہل عقبہ اور
شرکائے بدر کے بعد اہل مشاہدہ کا درجہ ہے، یعنی جو غزوہ پہلے ہوا ہے اس کے شرکاء ان
صحابہ سے افضل ہیں جو اس کے بعد غزوات میں شریک ہیں ۔ سورہ۔ الحدید میں ہے " تم
(مسلمانوں) میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں مال) خرچ کیا اور
دشمنوں سے لڑے وہ درجہ میں ان (مسلمانوں) سے بڑھ کر ہیں جنھوں نے (فتح مکہ کے)
بعد مال خرچ کیا اور لڑے اور (یوں) حسن سلوک کا وعدہ (تو) اللہ نے سبھی سے کر رکھا
ہے " ۔

ذوق نماز کے سلسلے میں صحابہ۔ کرام کا ذکر قرآن پاک میں آتا ہے کہ **کانو
قلیلا من اللیل مایھجعون** ○ " یہ لوگ عبادت میں مشغول رہنے کی وجہ
سے راتوں کو بہت ہی کم سوتے تھے " اور جب سورہ۔ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل
ہوئیں تو صحابہ۔ کرام تراویح کی طرح راتوں کو نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں پھول جاتے تھے
قرآن پاک (سورہ۔ السجدہ) میں ان کی فضیلت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ " ان کے

پہلو بستر سے الگ رہتے ہیں، وہ لوگ خوف ورجا سے اللہ کو پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں"۔ صدقات وخیرات کے سلسلے میں بھی ان کا ذکر آتا ہے۔ ایک بار حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے آٹھ ہزار درہم صدقہ میں دیے تو منافقین نے کہا کہ یہ ریاکار ہیں، لیکن ایک صحابیؓ نے ڈول کھینچنے کی اجرت میں ایک صاع حاصل کیا اور وہی صدقے میں دے دیے تو اس پر بھی منافقین نے جملہ کس دیا کہ اللہ اس حقیر خیرات سے بے نیاز ہے۔ اس موقعہ پر یہ آیت (سورہ توبہ) نازل ہوئی "یہ (منافق) ہی تو ہیں کہ مسلمانوں میں جو لوگ خوش دلی سے خیرات کرتے ہیں ان پر (ریاکاری کا) عیب لگاتے ہیں۔ غرض ان (سب) پر ہنستے ہیں۔ اللہ ان منافقوں پر ہنستا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ صحابہ کرام صدقہ دینے میں مسابقت کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ پیش کر دوں۔ ایک دن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ دینے کا حکم دیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نصف مال پیش کر دیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا کل سرمایہ لے کر حاضر ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑا؟ تو آپؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کا رسول۔ گویا:

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

ان بزرگوں کے لیے ہی یہ آیت نازل ہوئی کہ **من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً ۝** "کون ہے وہ جو اللہ کو اچھا قرض دے؟" غرض کہ ان کی جانی اور مالی قربانیاں ایسی تھیں کہ روے زمین میں پھر کوئی اور مثال نظر نہیں آئی۔ ان کی فضیلت کے سلسلے میں سورہ الفتح کی آخری آیت پیش کرنا بڑی سعادت ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت (لیکن) آپس میں بڑے رحمدل ہیں، تو دیکھتا ہے کہ وہ (کبھی) رکوع (کبھی) سجود میں ہیں (اور) اللہ سے اس کے فضل اور رضا کے طالب ہیں، ان کی علامت

ان کے چہروں پر عیاں ہے جو سجدوں کا اثر ہے۔ان کی تعریف توریت اور ان کے اوصاف انجیل میں (بھی) ہیں۔ان کی مثال ایک کھیتی کی ہے کہ اس نے پہلے (سوئی کی طرح پتی) نکالی، پھراس کو مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے بل پر کھڑی ہو گئی۔(یہ کھیتی) کاشتکاروں کو بھلی معلوم ہونے لگی، تا کہ کافروں کا جی جلے۔اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔اس آیت میں مفسرین کے نزدیک **معه** سے مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، **اشداء علی الکفار** سے مراد حضرت عمرؓ، **رحماء بینهم** سے مراد حضرت عثمانؓ، **رکعا سجدا** سے مراد حضرت علیؓ ہیں، رضی اللہ عنہم اور اس ترتیب سے کھیتی کا سوئی نکالنا، مضبوط ہونا، موٹا ہونا اور اپنے بل پر کھڑا ہونا بھی ان ہی خلفاء راشدین کے زمانے کی طرف اشارہ ہے۔

اب آخر میں ایک نکتہ عرض کیا جاتا ہے کہ سورہ توبہ میں ہے کہ مہاجرین اور انصار میں سے شروع کے لوگ اور وہ جو ان کے نقش قدم پر خوبی کے ساتھ چلے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے واسطے جنتیں تیار کی ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں اللہ پاک نے شروع شروع کے مہاجرین اور انصار (بلکہ ان کے متبعین کے لیے بھی) قطعی جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔شروع شروع کے صحابہ کرام وہ تھے جب کہ قرآن پاک پوری طرح نازل نہیں ہوا تھا، تو ظاہر ہے کہ ان کا درجہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے بلند ہوا۔

آپس کے اختلافات دور کرنے کے طریقے

دنیا کے لیے اسلام رحمت کا پیام لے کر آیا، اس نے مظلوموں کی دستگیری کی، کمزوروں کو طاقت بخشی، غلاموں کو آزاد کرایا۔ رنگ و نسل، عصبیت، جاہ و ثروت، طبقاتی عناد و مفاد وغیرہ کے تمام بندھن توڑے اور تقویٰ، نیکی اور پرہیز گاری کو بزرگی اور فضیلت کا معیار قرار دیا۔

سورہ۔ الحجرات میں ان بلیغ الفاظ کے ساتھ اعلان ہے "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف گروہ اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی پہچان کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ بہت جاننے والا اور خبردار ہے"۔

قرآن پاک کے اس اعلان سے صرف تقویٰ اور عمل صالح کو برتری حاصل ہوئی اور تمام قومی، نسلی اور طبقاتی امتیازات کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

"اللہ پاک نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آبا و اجداد پر فخر کرنے (کی جاہلی رسم) کو دور کر دیا ہے۔ اب (لوگوں کی اصل تقسیم صرف یہ ہے کہ) مومن نکوکار ہے یا فاجر اور بدکار (نسل اور نسب پر فخر کرنا کوئی معنی نہیں)۔ تمام لوگ آدم کی اولاد اور آدم کی اصل مٹی ہے۔ گویا کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں اور جو شخص اسلام میں داخل ہو گیا وہ پوری ملت اسلامیہ کا بھائی ہے اور اسے وہ تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو ایک بھائی کے دوسرے بھائی پر ہوتے ہیں۔ سورہ۔ توبہ میں

ہے:

"پس اگر یہ لوگ (کفر سے) توبہ کر لیں، نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں"۔

ایمان اور تقویٰ ایک ایسی نعمت ہے جو ایک مومن کو دوسرے کا بھائی بنا کر اس کے حقوق کا تحفظ بھی کرا دیتی ہے۔

سورہ۔ الحجرات میں ان باتوں کا بھی ذکر ہے، جن کی وجہ سے آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔

"اے ایمان والو! نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیے، کیا عجب ہے کہ (جن پر وہ ہنستے ہیں) وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیے، کیا عجب ہے کہ وہ ان (ہنسنے والیوں) سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دیا کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو کہ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا (ہی) برا ہے۔ اور جو (ان حرکتوں سے) باز نہ آئیں تو وہ ظلم کرنے والے ہیں۔ اے ایمان والو! گمانوں سے عموماً بچا کرو، کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور ٹوہ مت لگایا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ پس (یقیناً) تم کو اس سے گھن آئے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بڑا رجوع فرمانے والا مہربان ہے"۔

اس ارشادِ خداوندی میں اخوت اور بھائی چارے کا ذکر ہے۔ بھائی چارے کی ضرورت اس وقت اور زیادہ محسوس ہوتی ہے جب قوم کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ جس طرح ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کو ننگا، بھوکا اور تباہ کن مصیبت میں

دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے، اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ آج بھائی چارے اور اخوتِ اسلامی کے مظاہرے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کا بڑا حصہ سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ بے شمار مرد، عورتیں اور بچے یا تو سیلاب میں بہہ گئے یا بے خانماں و برباد ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی کا تمام اثاثہ سیلاب میں بہہ گیا ہے۔ اخوتِ اسلامی کا تقاضہ ہے کہ ہم سب ان کی مدد کو اٹھ کھڑے ہوں، بھوکوں کو کھانا پہنچائیں، بے کپڑوں کو کپڑے دیں اور ضرورت سے زیادہ جو دولت ہے وہ سب کی سب تباہ حال افراد کی مدد کے واسطے پیش کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کریں۔

حسد بھی ایک بہت بڑا عیب ہے اور حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ کسی کو کھاتا پیتا اور پھلتا پھولتا دیکھ کر دل میں جلنا اور اس کے زوال سے خوش ہونا، حسد کہلاتا ہے۔ گویا حسد کرنے والا اللہ پاک پر اعتراض کرتا ہے کہ اس نے فلاں شخص کو وہ نعمت کیوں دی، وہ تو اس قابل نہ تھا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور بہت بڑی ذلت ہے۔ اس عیب سے ہمارے معاشرے میں سخت انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ جس سے حسد کیا جائے اس کے لیے دعا کی جائے کہ اللہ پاک اسے اور بھی نعمتیں عطا فرمائے اور اس شخص سے احترام کے ساتھ مل کر معافی مانگی جائے۔

آپس کے اختلافات کو بڑھانے کے لیے وعدہ خلافی بھی ایک قبیح آلہ ہے۔ وہ نہ صرف منافقت ہے بلکہ معاشرے کے لیے اور خود کے لیے بڑی ذلت ہے۔ سورہ توبہ میں منافقوں کے سلسلے میں اس بد عہدی کو اس طرح یاد کیا ہے:

> "پس اس کا اثر ان کے دل میں اللہ نے نفاق رکھا، اس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے، کیوں کہ انھوں نے اللہ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے"۔

صحیحین میں بھی منافق کی نشانی یہ بتائی ہے کہ جب بولے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف کرے اور جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔ ظاہر ہے کہ ان عیوب سے ہمارا معاشرہ کس قدر متاثر ہوگا اور کیا کیا خرابیاں پیدا ہوں گی۔ پس اس کا علاج یہی ہے کہ غور کیا جائے کہ وعدہ خلافی سے خود اپنی ساکھ بگڑ جائے گی اور جب کسی کے دل میں عزت باقی نہ رہے گی تو خود اپنا ضمیر کس قدر ذلیل ہوگا اور یہ وعدہ نہ صرف انسانوں کے سامنے قابل مواخذہ ہے بلکہ، **ان العهد كان مسئولا** ٥ بے شک وعدہ کی بازپرس (اللہ کے سامنے بھی) ہوگی۔

ان کے علاوہ خیانت اور بددیانتی، غداری اور دغا بازی وغیرہ بکثرت رذائل ہیں، جن سے اختلافات بڑھ جاتے ہیں اور معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ آخر میں ہمیں سورہ آل عمران کے اس ارشاد کو نہ بھولنا چاہیے کہ:

> "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان، اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو، سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا، اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں بیر تھا، اس نے تمھارے دلوں میں ملاپ کر دیا تو اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی بھائی ہوگئے"۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين ٥

دعوت اور تبلیغ کے اصول

دین کی طرف بلانا اور دین کو ہر شخص تک پہنچانا ہر مسلمان پر واجب ہے، انبیاء علیہم السلام نے دین کی خاطر کیا کیا تکلیفیں برداشت کی ہیں اور طعن و تشنیع کے علاوہ کتنی جسمانی اذیتیں اور مصیبتیں بھی جھیلی ہیں۔ لیکن انھوں نے سخت سے سخت مزاحمت کے باوجود صبر سے کام لے کر دین کو نہایت شفقت اور محبت سے پہنچانے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے عزم اور حوصلے کی بدولت انھوں نے کامیابی حاصل کی، ارشاد خداوندی ہے: **ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال انني من المسلمين**o (یعنی " اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) ۔ دعوت الی الخیر اور ابلاغ دین ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور یہ مقصد علمی دلائل سے بھی پورا ہوتا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ سے بھی مؤذن کی اذان سے بھی اور مشائخ کی محفل ذکر سے بھی یعنی ہر وہ طریقہ جو اللہ اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کی طرف دعوت دیتا ہے، تبلیغ پر مشتمل ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: **ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون**o (اور تم سے ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے جو خیر کی طرف بلائے اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کرے اور برے کاموں سے روکا کرے اور ایسے ہی لوگ پورے کامیاب ہوں گے) ۔ یہ دعوت ہر گھر کے لیے بھی ہے اور عام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے بھی ہے، ایک

جگہ ارشاد ہے کہ **وامر اھلک بالصلوۃ واصطبر علیھا لانسئلک رزقا نحن نرزقک والعاقبۃ للمتقین** o (یعنی " اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیے اور خود بھی اس کے پابند رہیے، ہم آپ سے معاش نہیں چاہتے، معاش تو آپ کو ہم دیں گے اور بہتر انجام پرہیزگاروں کا ہے"۔)

ایک جگہ اس طرح بھی ارشاد ہے **وذکّر فان الذکری تنفع المومنین** o (یعنی " اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ تو لوگوں کو سمجھاتے رہیے۔ کیوں کہ سمجھانا ایمان والوں کو نفع دے گا) سہتاں چہ اس طرح تبلیغ کرنا کہ دھیرے دھیرے ہر خیر کی بات دلوں میں اتر جائے اور ہر برائی سے نفرت ہونے لگے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی خصوصیت ہے اور ان کی امت کے لیے بھی اس میں شرف ہے، کیوں کہ ایک جگہ یہ ارشاد ہے: **کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ** o (یعنی " تم بہترین امت ہو کیوں کہ تم لوگوں کی نفع رسانی کے لیے نکالے گئے ہو، تم لوگ نیک کام کا حکم کرتے ہو اور برے کام سے منع کرتے ہو اور تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو"۔)

اس آیت شریفہ میں مسلمانوں کو خیر امت اسی لیے کہا ہے کہ ان کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ خیر کی دعوت دیتے ہیں اور برائی سے نفرت دلاتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں سے یہ بات نہ صرف متوقع ہے بلکہ ان کی امتیازی خصوصیت بھی ہے کہ وہ دعوت دین کو ایک مستقل کام سمجھ کر اس میں لگے رہیں اور اسے اپنے لیے شرف سمجھیں۔ اللہ پاک کے نزدیک مسلمانوں کی یہ خصوصیت نہ صرف پسندیدہ ہے، بلکہ اس کے لیے اجر عظیم کا وعدہ بھی ہے، جیسا کہ سورہ نساء (ع ۱۴، آیت ۱۱۴) میں ہے کہ " عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی، ہاں اگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیرات

کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں اور جو شخص یہ کام کرے گا، حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے تو ہم عنقریب اجر عظیم دیں گے"۔

اس آیتِ مبارکہ سے یہ بات بھی واضح ہے کہ دین کی دعوت اپنی شہرت اور ریاست کے لیے نہ ہو بلکہ محض رضائے الہیٰ کے لیے ہو، یعنی اگر رضائے الہیٰ مقصود و منظور ہے تو اجر عظیم ملے گا ورنہ نہیں۔

دعوت اور تبلیغ کے سلسلے میں سب سے اہم چیز جس کی ضرورت مقدم ہے وہ "قول حسن" ہے۔ یعنی اچھی طرح کہنا اور حسن و خوبی کے ساتھ دین کو پیش کرنا اور "قولِ لیّن"، یعنی نرم بات کہنا جس طرح موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ **قولا له قولا لینا**۔ یعنی "تم اس (فرعون) سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کر لے"۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ میٹھے بول اور نرم گفتگو کی بھی ضرورت ہے تاکہ نصیحت اثر کر سکے، سخت گفتگو ہمارے یہاں ایسے موقع پر قطعی ممنوع ہے کیوں کہ ایسی گفتگو سے کوئی اثر نہیں ہوتا اور جس مقصد کے لیے گفتگو کی جاتی ہے، وہی فوت ہو جاتا ہے، سورہ، نساء میں قولِ معروف کے لیے بھی حکم ہے یعنی "معقول بات کرنا اور حق و انصاف سے کہنا"، کیوں کہ قرآن خود قولِ فیصل ہے۔ جیسا کہ سورہ، الطارق میں ہے، یعنی جب قرآن ہی فیصلہ دینے والا کلام ہے تو اس کے ماننے والے بھی حق و انصاف سے قریب ہوں گے اور ان سے قول معروف کی توقع کی جائے گی۔

سورہ، الاحزاب میں بھی ہے کہ "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سدید (راستی) کی بات کہو"۔ اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر یہ ہے کہ اے ایمان والو! ہر معاملے میں صرف اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کی بھی اطاعت کرو اور کلام کرنے میں بالخصوص اس بات کی بہت رعایت رکھو کہ جب بھی بات کرو تو راستی کی بات کہو، جہاں عدل اور اعتدال سے مطلق تجاوز نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کے صلے میں

تمھارے اعمال قبول کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔ یعنی کچھ ان اعمال کی برکت سے اور کچھ توبہ کی برکت سے جو تقویٰ اور قول سدید میں داخل ہے۔ یہ فضل ہو گا اور ثمراتِ مذکورہ اطاعت پر مبنی ہیں، اجمالاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ دعوت اور تبلیغ کے لیے حسن وخوبی کے ساتھ راستی کی بات اس انداز سے کہی جائے کہ سننے والا اس سے نصیحت پکڑے اور اسے ناگوار نہ ہو۔

پھر میٹھے بول اور نرم گفتگو بھی ایسی ہو کہ اس سے سخت، بحث اور مباحثہ کی گنجائش نہ نکلنے پائے، کیوں کہ یہ بھی حکم ہے کہ آپ اپنے رب کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے اور ان کے ساتھ احسن طریقہ سے بحث کیجیے (النحل) یعنی دین کی طرف کی احسن باتوں کے ذریعے سے بلانا چاہیے، کیوں کہ اسی ذریعے سے اثباتِ مدعا ہو سکتا ہے اور اچھی نصیحتوں سے سمجھانے کا اثر بہت ہوتا ہے۔ اگر بحث آن پڑے تو شدت اور خشونت کے بغیر بحث کیجیے، سورہ۔ النحل کی اس آیت کے بعد ہی یہ بھی ارشاد ہے کہ "آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر کرنا خاص اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجیے اور جو کچھ یہ (کفار) تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہوئیے"۔ یعنی اس آیت سے تبلیغ کا ایک پہلو بھی نکلتا ہے کہ دین کی تبلیغ کے لیے علم کی باتوں اور نصیحتوں کے ذریعے سے بلانے کے باوجود اگر کفار ایذا رسانی شروع کر دیں تو صبر کیا جائے، خود صبر کرنے سے بھی مخالف پر اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والوں پر بھی، یعنی صبر بھی ایک حکمت ہے اور صبر کرنے والے کے لیے اجر عظیم بھی ہے۔

تبلیغ کے لیے یہ چیز بھی بہت ضروری ہے کہ جس امر کی تبلیغ کی جائے، پہلے اس پر خود بھی عامل ہو، ورنہ کوئی اثر نہ ہوگا۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ "کیا تم حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو، حالاں کہ پڑھتے ہو کتاب! کیا تم سمجھتے نہیں؟" اسی مضمون سے متعلق ایک حدیث بھی ہے۔ فرمایا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ "قیامت کے دن آدمی کے قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتے،

جب تک چار سوال نہ کر لیے جائیں،

(۱) عمر کس مشغلے میں ختم کی؟

(۲) جوانی کس کام میں خرچ کی؟

(۳) مال کس طرح کمایا تھا؟

(۴) اور اپنے علم پر کیا عمل کیا تھا؟

ایک اور حدیث میں ہے کہ علم دو طرح کا ہوتا ہے:

(۱) ایک وہ جو صرف زبان پر ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا الزام ہے، اور گویا اس عالم پر حجت تام ہے۔

(۲) دوسرا وہ علم ہے جو دل پر اثر کرے، وہ علم نافع ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ علم بے کار ہے، جس میں اخلاص نہ ہو، یعنی اخلاص کے بغیر عمل بھی بے کار ہے اور عمل کے بغیر علم بھی فضول ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بھی فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ تمھاری صورتوں اور تمھارے اعمال کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں کو اور تمھاری نیتوں کو دیکھتا ہے، قرآن پاک میں بھی اسی طرح ہے "اللہ کو گوشت اور خون، نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔ یعنی اللہ پاک تمھارے تقویٰ کو دیکھتا ہے جس کا تعلق دل سے اور اخلاص سے ہے۔

دعوت اور تبلیغ میں یہ بھی ضرورت ہے کہ دین کی بات اس طرح کی جائے کہ اس میں کسی کی تحقیر اور تنقیص نہ ہو۔ بعض لوگ خود کو دین کا علمبردار سمجھتے ہوئے مخاطب کی تحقیر کرنے لگتے ہیں اور اس پر طعن و تشنیع شروع کر دیتے ہیں، یہ طریقہ ہمارے یہاں مذموم ہے اور کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس جگہ جگہ ارشاد ہے کہ دوسری کی پردہ پوشی کرو اور خصوصیت سے ایک مسلمان کی پردہ پوشی کے لیے سخت تاکید ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور جو شخص مسلمان کی پردہ دری کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی پردہ دری فرماتا ہے حتیٰ کہ گھر بیٹھے اسے رسوا کر دیتا ہے۔

دعوت دین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو بات کہی جائے اس کی پوری تحقیق کر لی جائے۔ ارشادِ الہیٰ ہے کہ **ولا تقف مالیس لک به علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنه مسئولا** ٥ یعنی "جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو، اس پر عمل درآمد نہ کیا کر۔ کان، آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی پوچھ گچھ ہوگی"۔ تبلیغ جیسے اہم کام کے لیے تحقیق نہایت ضروری ہے۔ ورنہ بنیاد کج سے دیوار کج ہی تیار ہوگی۔ اس طرح سوائے خسران کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس آیتِ مبارکہ میں بھی عمل کے لیے حکم ہے کہ تحقیق کے بعد ہی عمل کریں اور علماء سو سے بچ کر علماء حقانی سے رجوع کریں تاکہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو سمجھا کر ہر بات کو پایہ۔ تحقیق تک پہنچا سکیں اور صحیح عمل کی نشان دہی کر سکیں۔ دعوت اور تبلیغ کرنے والے کے لیے اس دور میں یہ بات از بس ضروری ہے کہ وہ خود بھی کسی اہل اللہ کی صحبت حاصل کرے، تاکہ خشیت اور سکینت بھی حاصل رہے اور اس طرح وہ مخاطب کے ایمان کو بھی تازہ کر سکے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق سورہ۔ انفال میں فرمایا گیا ہے کہ "ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کو یاد کیا جائے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو ان کا ایمان ترقی پائے اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا کریں، وہ نماز قائم رکھیں اور ہمارے دیے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کریں۔ یہی سچے مسلمان ہیں، ان کے لیے درجے ہیں، ان کے رب کے پاس بخشش ہے اور عزت کی روزی۔

اسلامی زندگی کی برکات

اسلام اس نعمت کا نام ہے جس کی برکت سے انسانی زندگی سراپا رحمت بن سکتی ہے اور اس زندگی کا حاصل یہ ہے انسان نہ صرف زبان سے بلکہ اپنے عمل سے صرف اللہ کو سب سے برتر سمجھے اور سوائے اس کے کسی کے آگے سر نہ جھکائے چناں چہ ہر طاقت کا انکار اور صرف اللہ کی طاقت کا اقرار ایک موحد کے لیے بنیادی عقیدہ ہے، اسی عقیدے کا نام توحید ہے۔ توحید کی قوت کے سامنے بڑی سے بڑھی طاقتیں پاش پاش ہو جاتی ہیں۔

اللہ پر ایمان لانے کے بعد رسالت پر ایمان لانا بھی لازمی ہے کیوں کہ رسول ہی وہ برگزیدہ ہستی ہے، جن کے نقش قدم پر چلنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی پیروی ہے یعنی عمل کے ذریعے ایمان کی مقتضیات کا اظہار ہی اسلام ہے، سورہ البقرہ کے آخر میں ہے: "رسول اللہ ایمان لائے ان باتوں پر جو ان کے رب کی طرف سے نازل کیں گئیں اور مومن لوگ بھی، (ایمان لائے) سب ایمان والے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، (وہ کہتے ہیں کہ) اور ہم جدا نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی کو اور کہتے ہیں کہ ہم سنتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں، اے ہمارے رب ہمیں اپنی بخشش عطا کر، تیری طرف واپس ہونا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ذیل کی باتوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔

(۱) اللہ پر ایمان۔

(۲) فرشتوں پر ایمان کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کے فرمانبردار اور نظام عالم کے

امور پر مامور ہیں۔

(۳) کتابوں پر ایمان، یعنی وہ کتابیں جو اللہ پاک نے وقتاً فوقتاً اپنے رسول پر اتاریں۔

(۴) گزشتہ رسولوں پر ایمان کہ وہ سب اللہ کے بندے تھے اور انسان کی ہدایت کے لیے مامور تھے۔

(۵) واپس ہونے پر ایمان، یعنی آخرت کا یقین کہ ہمیں اس دنیا کی زندگی کے بعد اللہ پاک کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ جہاں تمام اعمال کا حساب ہوگا اور اس کے بعد ان کے نتائج ضرور ملیں گے۔

لفظ ایمان اور اسلام کی وضاحت سورہ الحجرات میں اس طرح آتی ہے۔(عرب) کے گنوار لوگ کہتے ہیں کہ ہم مطیع ہوئے اور حالت یہ ہے کہ ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس آیت شریفہ میں وضاحت ہے کہ ایمان کی پہچان عمل سے ہوتی ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی فرمانبرداری ضروری ہے، صرف زبانی طور پر تسلیم کر لینا کافی نہیں بلکہ افعال و اعمال بھی شہادت دیں۔ تب صحیح اسلام کہلایا جائے گا اور یہی اسلام ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں، سورہ آل عمران میں ہے کہ **ومن یبتغ غیر الا سلام دینا** "اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارے میں رہے گا۔

سورہ اعراف میں ہے کہ "اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجیے کہ بے شک میری نماز، میری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے اس کا کوئی ہمسر نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلم ہوں (یعنی اللہ کا سب سے پہلا فرمانبردار ہوں)"۔ اس آیت سے بھی یہ بات واضح ہے کہ صرف اللہ پاک کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور اپنے کاموں کو

صرف اسی کی رضا کے لیے وقف کر دینا ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیے اور اسی وجہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ چوں کہ اس کی رضا کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ وقف کر چکے ہیں۔ اس لیے آپ ان اوصاف کی وجہ سے سب سے پہلے مسلم ہیں، گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی، ایک جامع، کامل اور مکمل اسلامی زندگی ہے۔ جس کی پیروی ہی سے دنیا اور آخرت کی برکات حاصل ہو سکتی ہیں۔

اللہ پاک پر ایمان لانا ہی سب سے بڑی ہدایت ہے کیوں کہ اس کا خوف اور اس کی رحمتوں کی امید سے انسانی زندگی ہر فرد اور جماعت کے لیے باعث برکت بن جاتی ہے جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مجھے مرنا ہے اور آخرت میں اللہ کو منہ دکھانا ہے وہ تمام منہیات سے بچتا ہے۔ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ جھوٹ، دغا، فریب، عیاری، مکاری، رشوت، ناپ تول میں کمی کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، غیبت کرنا، چغلی کرنا، حق تلفی کرنا وغیرہ کبائر وصغائر سے بچ کر اپنی زندگی کو متوازن طریقے پر اور اللہ کی رضا کے لیے وقف کر دینے سے امن و امان قائم رہتا ہے اور فرد اور جماعت سب کی زندگی پر امن طریقے پر گزاری جا سکتی ہے۔ خود ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے، کیوں کہ یہ لفظ "امن" سے بنا ہے اور مصدر متعدی ہے۔ جس کے معنی ہیں "امن کر دینا" یا "امن دینا" اسی لیے اللہ پاک کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام المومن بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں "امن عطا کرنے والا" چناں چہ اس کے حکم کے ماننے کو ایمان اور ماننے والے کو مومن اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کو ماننے کے بعد سلامتی پسند ہو جاتا ہے اور سب کے لیے امن کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اللہ پاک نے ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے سورہ۔ "النور" میں بھی بشارت دی ہے، فرمایا ہے کہ "اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور انھوں نے عمل صالح کیے ہیں کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا

(یعنی زمین کی حکومت عطا کرے گا)، جس طرح اس نے خلیفہ بنایا تھا ان کو، جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں، اور البتہ ان کے لیے ان کے دین کو مضبوط کر دے گا جس کو اس نے پسند کر لیا ہے اور وہ ان کے خوف کو دور کرنے کے بعد امن سے بدل دے گا"۔ یہ ارشاد کس قدر ہر زمانے میں صحیح ثابت ہوا کہ جب کبھی مسلمان صحیح مسلمان کا جذبہ لے کر اٹھا اور اس نے اپنا رشتہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ کیا وہ ہمیشہ کامیاب اور فائز المرام رہا اور فاتح اور حاکم کی حیثیت سے قائم ہوا۔ لیکن جہاں اس نے یہ رشتہ توڑا وہیں اس کا زوال شروع ہوا اور اس کی حکومت میں انتشار اور ابتری پھیلی، کیوں کہ حاکم کے لیے بھی تو شرط ہے کہ وہ اوامر اور نواہی کا پابند رہے۔

سورہ۔ الحج میں صاف طور پر فرمایا ہے کہ "(وہ مسلمان ہیں) جن کو اگر ہم زمین میں غلبہ اور اقتدار دیں تو وہ نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور ناپسند باتوں سے لوگوں کو روکیں گے اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے"۔ اس آیت مبارکہ میں مجملاً چار باتوں کی وضاحت و صراحت ہے۔

(۱) نماز قائم کرنا۔

(۲) زکوٰۃ ادا کرنا۔

(۳) امر معروف یعنی اعلیٰ تہذیب و اخلاق کی اشاعت و ترویج

(۴) اسلام کے نزدیک جو باتیں ناپسندیدہ ہیں ان سے عوام کو روکنا۔

یہ چار چیزیں اوامر اور نواہی کی اصل ہیں اور انھی سے خیر و شر کا قیام ہوتا ہے۔ پھر اسی آیت میں اللہ پاک نے یہ بھی فرمایا کہ تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے، یعنی اگر کوئی قوم حکومت کے حصول کے بعد نماز، زکوٰۃ اور امر معروف کی ترویج نیز منہیات سے روکنے کا انتظام نہیں کرتی تو اللہ پاک کو اختیار ہے کہ وہ اس عطا کردہ حکومت کو چھین لے۔ آیت کا یہی مطلب ہے اور اسلامی زندگی کا تقاضا بھی یہی ہے۔

سورہ۔ الانبیاء میں بھی اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ "اور البتہ ہم نے زبور میں نصیحت کے

بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے، بیشک اس میں عبادت کرنے والے (یا فرمانبردار) لوگوں کے لیے ایک پیام ہے"۔ زمین کی وراثت کا حق ان ہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو عمل صالح اختیار کرتے ہیں، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول بن جاتے ہیں۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ یعنی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو قومیں حاکم ہیں وہ اکثر ایسی ہیں جو نہ ایمان رکھتی ہیں اور نہ عمل صالح پھر وہ کیوں کر حاکم ہیں؟

دراصل ایمان امن کرنے اور امن دینے کے متقاضی ہے۔ اگر کسی قوم کو حکومت ملنے کے بعد امن کرنے اور امن دینے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ قائم نہیں رہتی۔ قرآن پاک میں ایسی حکومت کے لیے ایک عمدہ مثال "سورہ۔ النحل" میں آتی ہے: "اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کے بس میں (یا ملکیت میں) ہے کسی چیز پر اس کا بس نہیں چلتا اور ایک وہ ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھی روزی عطا کی ہے اور وہ اس میں سے چھپا کر اور ظاہر طور پر جیسا بھی موقع ہو خرچ کرتا ہے، کیا سب برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے بلکہ (یہ وہ بات ہے جسے) ان میں سے اکثر نہیں جانتے"۔

اسلامی زندگی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو خیر وخوبی کے ساتھ ادا کرنا ہی اصل برکات ہیں، جن کا حصول نظام عالم کے لیے ضروری ہے حالی نے بھی توحید اور حقوق اللہ کے بعد اسی چیز کو اسلامی زندگی اور عین عبادت کہا ہے کہ

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

احترام انسانیت

انسان اور انسانیت بذاتِ خود لائق احترام ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا ہے۔ انسان کی پیدائش کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **بدا خلق الانسان من طین o ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین o** یعنی اللہ نے انسان کی پیدائش کی ابتدا مٹی سے کی پھر اس کی نسل مٹی کے جوہر یعنی حقیر پانی سے بنائی۔ دوسری جگہ (سورہ نسا) میں ارشاد ہے کہ "اے لوگو، ڈرو اپنے رب سے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتوں کو (دنیا میں) پھیلا دیا" ۔ گویا سب انسان ایک ہی جوڑے سے ہیں اور اپنی تخلیق میں ایک ہی ہیں، ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنا دیے کہ تم شکر ادا کرو" ۔ اس آیت میں سننے کی قوت، دیکھنے کی قوت اور دل (یعنی اچھے برے میں تمیز اور علم کی قوت) کا بطور خاص ذکر فرمایا، کیوں کہ ان ہی قوتوں پر تعلیم اور کمال حاصل کرنے کا انحصار ہے اور یہیں سے انسان اور غیر انسان کے درمیان حد فاصل قائم ہوتی ہے۔ پھر انسان کی فضیلت سے متعلق کس قدر واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ **وعلم آدم الاسماء کلھا** یعنی آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے ۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ انسان جس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، اپنے اندر اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ تمام چیزوں کے متعلق علم حاصل کر سکتا ہے اور آسمانوں میں نیز زمین میں جو کچھ بھی ہے اس پر تسلط قائم کر سکتا ہے۔ انسان کی

صلاحیت اور اس کی فضیلت کے بارے میں جگہ جگہ ارشادات ہیں، ایک جگہ اس طرح فرمایا ہے کہ **ولقد کرمنا بنی آدم وحملنا ھم فی البر والبحر ورزقنھم من الطیبات وفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا** (اور بیشک ہم نے برتری دی آدم کی اولاد کو اور خشکی وتری میں ان کو سوار کر دیا اور عمدہ اور پاک چیزوں کی ان کو روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر ان کو فضیلت دی) اس سے واضح ہے کہ انسان کی فضیلت اور برتری کے لیے تسلط کی صلاحیت بھی بخشی ہے اور عمدہ اور پاک چیزوں کے حاصل کرنے کی قابلیت بھی عطا فرمائی ہے۔ یعنی دنیا کی تمام پاک چیزوں اور قابل قدر نعمتیں حاصل کرنے کے لیے بھی اسے جینا ہے۔ تاکہ نظام عالم قائم رہے اور اس نظام عالم میں صرف انسان کا تسلط رہے۔ تاکہ غیر انسانی طاقتیں مغلوب رہیں اور کسی طرح کی خرابیاں پیدا نہ ہوں، انسان جب نظام عالم اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا اور اسے طاغونی طاقتوں کے سپرد کر دیتا ہے تو خشکی اور تری میں افراتفری پھیل جاتی ہے۔ ایسی طاغوتی طاقتوں پر غلبہ رکھنے اور افتراق ونفاق کو ختم کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے: "پہلے سب لوگ ایک ہی امت تھے پھر ان میں اختلافات ہوگئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا جو (نیک عمل کی زندگی پر) بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق اتاری تاکہ حق کے متعلق جو لوگوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے ان کا وہ فیصلہ کریں، اختلاف ان ہی لوگوں نے کیا تھا جن کو حق کا علم دیا گیا تھا اور واضح احکام ان کے پاس آگئے تھے، آپس میں بغاوت اور زیادتی کی وجہ سے تھا، پس سچائی کی طرف اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی جس میں اختلاف ہوگیا تھا اور اللہ جسے چاہتا تھا سیدھی راہ دکھاتا تھا"۔ اس سے واضح ہے کہ وہ نسل آدم جو ابتداء میں سیدھے راستے پر تھی پھر جب ان لوگوں میں حق کے علم کے باوجود اختلاف ہوا تو انبیاء علیہم السلام نے ان کی ہدایت فرمائی۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ صراط مستقیم پر قائم ہوئے اور کچھ الگ ہوگئے اور

ہدایت نہ پاسکے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ "شیطان نے ان پر قابو پا لیا ہے، پس اس نے ان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے، یہ شیطان کی جماعت ہے یاد رکھو شیطان کی جماعت ہی نقصان اٹھانے والی ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے صراط مستقیم کی طرف جس طرح رہبری فرمائی ہے، اس پر نہ چلنا قانون فطرت سے جنگ کرنا ہے، اور ایسے لوگ جو خدا کو چھوڑ کر صرف دنیاوی راحت اور سکون کی زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتے، محض دولت کی فراوانی اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لینا انسانیت اور انسان کی توہین کرنا ہے کیوں کہ یہ چیز ان کے منصب سے بہت گری ہوئی ہے۔ **ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** o (اور میں نے پیدا نہیں کیا جن اور انسان کو، مگر صرف اپنی عبادت کے لیے)۔ اس آیت سے یہ پیام ملتا ہے کہ وہ انسان جو اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے، صرف خدا کے آگے جھک سکتا ہے، اگر وہ کسی اور کے آگے جھکے گا تو یہ حرکت خود اس کے منصب کے لیے ذلت ہے اور وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں، بقول اقبال:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

کلمہ **لا الہ الا اللہ** کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان اپنے بلند مقام کو پہچانے اور سوائے اللہ کے کسی اور طاقت کے آگے سر نہ جھکائے، انسانیت اور آدمیت کا یہی تقاضا ہے اور یہی چیز اس کے لیے طرہ، امتیاز ہے کہ وہ صرف خدا کا بن کر رہتا ہے اور کسی کا نہیں بنتا ذرا غور فرمایئے کہ وہ انسان جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، اللہ کا نائب اور خلیفہ بنایا جاتا ہے، یعنی اس سے اگر کوئی بلند و ارفع ہے تو صرف اللہ کی ذات ہے اور اللہ کے بعد ہی جس کا درجہ سب سے بلند ہے وہ انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اتنا بڑا مرتبہ عطا فرمایا کہ اپنا نائب بنا لیا تو اس کی شان کریمی کا یہی تقاضا تھا کہ وہ

انسان کو بار بار اس کے منصب کی یاد دلائے اور اپنے پیغمبروں کے ذریعے اس کے مقام کی وقعت سے آگاہی کراتا رہے، پھر جن لوگوں نے اس کی نافرمانی کی اور خود اپنے درجے سے گر کر عمل کرنے لگے تو ان کے لیے سخت عذاب نازل ہوا۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان کی اطاعت نہ کر کے گوسالہ پرستی کی تو ارشاد ہوا کہ "جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے ذلت کی مار اس دنیا کی زندگی میں پڑے گی اور ہم افترا پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں"۔ اسی طرح جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی تھی۔ ان کے متعلق ارشاد ہے کہ "ان کو زلزلے نے آپکڑا سو اپنے گھر میں اندھے کے اندھے پڑے رہ گئے۔ اسی طرح ایک جگہ نافرمان لوگوں کی تباہی کا ذکر اس طرح ہے کہ "اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں، جو اپنے سامان عیش پر نازاں تھے سو (دیکھ لو) یہ ان کا گھر (تمھاری آنکھوں کے سامنے) پڑے ہیں، ان کے بعد آباد ہی نہیں ہوئے، مگر تھوڑی دیر کے لیے اور آخر کار ہم ہی مالک رہے اور آپ کا رب بستیوں کو (اول بار ہی) ہلاک نہیں کیا کرتا، جب تک کہ وہ ان بستیوں میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج دے کہ وہ ان لوگوں کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے"۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب اپنے منصب سے ہٹ کر اپنے اللہ کے آگے جھکنے کے بجائے غیر اللہ کے آگے جھکتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے انسان کی ذلت کو پسند نہیں کرتا اور پھر ایسے انسان کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ گویا انسان اور انسانیت کے بجائے اس کی سربلندی اور سرفرازی دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر یہ اسی کا کرم ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے دین میں جہاں شجر، حجر، نباتات، جمادات اور حیوانات کے بے جا استعمال سے منع کیا گیا ہے۔ وہیں ان سے فائدے حاصل کرنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ یہ اسی کے پیارے بندے تھے جنھوں نے دن بھر کی کمائی کے تھوڑے سے جو کی تین روٹیاں بنالیں اور خود دن بھر بھوکے رہ کر محض اللہ کی خوشنودی کے لیے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیا اور پورا گھر دوسرے دن کے

فاقے کے لیے تیار ہو گیا، آخر یہ انسان اور انسانیت کا احترام نہیں تو کیا تھا؟ یہ اسی کے پیارے ہیں جنھوں نے دین کی جنگ کے بعد کافر قیدیوں کو اپنا مہمان سمجھا اور مہمان کی طرح ان کی خاطر مدارات کی ایک جگہ تو یہاں تک بشارت آتی ہے کہ "اے پیغمبر آپؐ کے قبضے میں جو قیدی ہیں ان سے فرما دیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تمھارے قلب میں ایمان معلوم ہو گا تو جو کچھ تم سے فدیہ لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو دے دے گا، اور (آخرت میں) تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے۔

یہ احترام انسانیت ہی کے لیے حکم ہے کہ رشوت نہ کھاؤ، ارشاد ہے کہ "تم آپس میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ اس کو حاکم کے آگے اس غرض کے لیے پیش کرو کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ کھانے کا موقع گناہ کے ذریعے مل جائے جب کہ تم کو اس کا علم ہو"۔ پھر یہ حکم بھی احترام انسانیت ہے کہ غلط طریقہ سے نفع خوری نہ کرو حکم ہے کہ "اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے مت کھاؤ۔ یعنی دین آپس کی رضامندی سے ہو (تو یہ اور بات ہے) اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو"۔ گویا بہت لطیف انداز میں یہ فرما دیا کہ باطل طریقے سے لین دین کرنا بھی ایک قسم کا قتل یا ہلاکت ہے۔ پھر یہ بھی احترام انسانیت کے خلاف ہے کہ ناقص مال دیا جائے، حق بات کی شہادت نہ دی جائے، خرید و فروخت میں دھوکا دیا جائے، جوا وغیرہ میں پیسہ ضائع کیا جائے، فال اور شگون لیا جائے ایک جگہ کھیل تماشے کا بھی ذکر آتا ہے کہ لوگوں میں وہ بھی ہیں جو خریدتے ہیں باتوں کا کھیل تماشا تاکہ بے علمی کی وجہ سے لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکائیں اور اسے ہنسی مذاق (کا ذریعہ) بنائیں۔ ان ہی کے لیے ذلیل اور کمزور کرنے والا عذاب ہے۔ یہ سب باتیں اگر بغور دیکھی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ پھر وہ انسان اور وہ مسلمان کتنا بدبخت ہے جو عمداً کسی مسلمان بھائی کو قتل کر کے خود کو ہمیشہ کے لیے ذلت کے عذاب کا مستحق بنا لے۔ اللہ تعالیٰ نے روز حساب بھی مقرر کیا ہے،

جب کہ ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا جائے گا اور بے شک، کان، آنکھ اور دل سب سے پوچھ گچھ ہوگی۔ احترام انسانیت دراصل اللہ تعالیٰ کے نائب کا احترام ہے اور اس کے خلیفہ کا مقام ہے۔ انسان کے مقام کے متعلق علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے کہ

باخبر شو از مقامِ آدمی
آدمیت احترامِ آدمی

صراط مستقیم

صراط مستقیم جس کے حصول کے لیے ہر نماز کی ہر رکعت کی سورۃ الفاتحہ میں دعا کی جاتی ہے، اس راستے کو کہتے ہیں جس پر انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صلحاء گامزن ہیں۔ کیوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ پاک نے انعام فرمایا ہے۔ سورہ، نساء میں ہے کہ "اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرے گا تو وہ ان حضرات کے ساتھ ہوگا، جن پر اللہ پاک نے انعام فرمایا ہے (یعنی) انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں" گویا صراط مستقیم، کمال اطاعت کا دوسرا نام ہے، کیوں کہ صدیق بھی اسی اطاعت کی وجہ سے نبی کے بعد سب سے افضل ہوتا ہے۔ شہید بھی اسی اطاعت کی وجہ سے اللہ کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگا کر بلند درجات حاصل کرتا ہے اور صالح تو صرف اس کو کہتے ہیں جو نبی کی پیروی کرتا ہے۔ کیوں کہ نبی کی پیروی ہی دراصل عمل صالح ہے۔ ان حضرات کے درجات عالیہ صرف اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی وجہ سے بلند ہوتے ہیں اور اسی لیے وہ انعام پانے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ حتاں چہ مناسب معلوم ہے کہ چند ایسے تاریخی واقعات عرض کیے جائیں جو اسلام کے صراط مستقیم ہونے پر دال ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ پاک نے پہلے ہی یہ خبر سارے عالم میں سنا دی تھی کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ دین برحق کو تمام دوسرے مذاہب عالم پر غالب کر دیں۔ سورہ، الفتح میں ہے کہ "وہ اللہ ایسا ہے

کہ اس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ وہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دیں۔"

اسلام کے عروج کے وقت کفر کی دو بڑی طاقتیں تھیں ایک ایران فارس کی تھی جس کا مذہب مجوسی تھا اور جہاں خالق کے بجائے اس کی مخلوق یعنی آگ کی پرستش کی جاتی تھی اور دوسری طاقت روم کی تھی جس کا مذہب عیسائی تھا اور جہاں عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا جاتا تھا۔

عالموں اور درویشوں کو رب بنا لیا گیا تھا۔ عراق اور اس کے نواح کا علاقہ ایران فارس کی سلطنت میں شامل تھا اور شام وغیرہ روم کی حکومت میں شمار ہوتا تھا پس آیت مذکورہ میں ان دونوں سلطنتوں اور ان کے مذہبوں کا دین برحق کے علمبرداروں کے زیر نگیں ہونا اور ان سب کی شان و شوکت کا دین الہیٰ کے سامنے سرنگوں ہو جانا ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لوازم میں سے قرار پایا گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالتہ الخفاء میں اس آیت کی تفسیر میں یہی بات تفصیل سے سمجھائی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت کے مطابق ان کے خلیفہ ارشد یعنی سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی قلیل مدت خلافت میں ان دونوں سلطنتوں کی فتح کی بنیاد ڈالی اور اس کی تکمیل حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئی۔ عراق میں شہر بصرہ کی فتح اور ہرقل بادشاہ روم کے مقابلے میں جنگ یرموک کی بے مثل فتح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے کارنامے ہیں۔

صراط مستقیم کی حقانیت کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا بھی ایک بہت قوی دلیل ہے۔ سورہ طٰہٰ کی ابتدائی آیتیں انھوں نے اپنی بہن سے سنی تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہو گئے۔ کہاں تو یہ ارادہ تھا کہ حضور کو شہید کر دیں گے اور کہاں یہ ہوا کہ خود شکار ہو گئے اور ان کے مسلمان ہوتے ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کے ساتھ کعبہ میں نماز پڑھی اور روز بروز اسلام کی

قوت وشوکت بڑھتی گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر کا مسلمان ہو جانا اسلام کی فتح تھی اور ان کی ہجرت نصرت الہیٰ تھی اور ان کی خلافت اللہ کی رحمت تھی۔ ہجرت کے بعد سب سے بڑی خدمت مغازی کی تھی اور حضرت عمرؓ نے اس سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دیں ہیں۔ غزوہ۔ بدر میں ان کے کارنامے بہت زیادہ ممتاز رہے۔ یعنی انھوں نے اسلام کے لیے اپنے ہاتھ سے جنگ کے دوران اپنے حقیقی ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا۔ اسی غزوے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس جو کافروں کے ساتھ جنگ میں تھے اور ہارنے پر قید ہوئے تھے، مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے تھے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ایسا نہ چاہتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور کی رائے کی پرزور حمایت کی لیکن بقیہ قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ ہر مسلمان اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے اور یہی بات اللہ پاک نے بھی پسند فرمائی۔ چنانچہ سورہ الانفال کی آیت نازل ہوئی کہ نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیے جائیں) جب تک وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خون ریزی نہ کر لیں۔ بہرحال شان رحمت جوش میں آئی اور ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا، اس کے علاوہ عراق، شام، روم کی تمام فتوحات اللہ پاک کے فرمان کے مطابق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو تمام مذاہب پر غالب کرنے کے لیے تھیں اور ان سب فتوحات میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شرکت غالب تھی۔

صراط مستقیم کی حقانیت کے لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ قبول اسلام کے متعلق بھی اہم ہے، جب آپ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تو کفار قریش نے آپ کو بہت ایذائیں دیں اور ایک دن آپ کے چچا حکم بن عاص نے آپ کو پکڑ کر رسی کے ساتھ مضبوط باندھ دیا اور

کہا کہ تم نے اپنے باپ دادا کا دین ترک کر کے نیا دین اختیار کیا ہے تو میں تم کو ہرگز نہیں کھولوں گا۔ جب تک تم اس نئے دین کو ترک نہ کرو گے۔ حضرت عثمان نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم میں دین اسلام کو کبھی ترک نہ کروں گا۔ آخر وہ ظالم اپنے ظلم سے عاجز آگیا اور آپ کو رہائی حاصل ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلام کی تبلیغ کی خاطر مالی اور جانی قربانیاں بہت دی ہیں اور ہجرت کے بعد غزوہ بدر سے لے کر غزوہ تبوک تک ہمیشہ بنفس نفیس شرکت کی ہے۔ غزوہ تبوک میں مسلمانوں پر افلاس طاری تھا، اسی وجہ سے اس کو غزوہ جیش العسرۃ بھی کہتے ہیں۔ اس موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو شخص اس لشکر کا سامان درست کرے گا، اسے جنت ملے گی، حضرت عثمانؓ نے عرض کیا میں دو سو اونٹ دوں گا، پھر عرض کیا میں تین سو اونٹ دوں گا اس کے بعد آپ گھر گئے اور ایک ہزار اشرفیاں لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں رکھ دیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تھے تو بیٹھ گئے اور ان اشرفیوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر ڈالتے ہوئے یہ فرماتے تھے کہ آج کے بعد عثمانؓ جو چاہیں کریں کوئی کام ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی فتوحات ہوئیں۔ ہمدان، سکندریہ، آذربائیجان، آرمینیہ کی فتوحات کے علاوہ افریقہ کی حرب العبادلہ جیسی جنگ عظیم کی فتح کا سہرا بھی آپ ہی کے سر رہا، طرابلس، اندلس اور مغرب کے کئی شہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے غلبہ کے لیے فتح ہوئے۔ ایران کے بقیہ حصے، یعنی خراسان، بحرین، فیروز آباد، شیراز، طوس، نیشاپور اور آگے ہرات اور بلخ وغیرہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وجہ سے فتح ہو کر دین کے لیے مرکز بنے۔

پھر دین کے غلبہ کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بہت قربانیاں دیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہجرت کے وقت اپنے بستر پر انھیں لٹا دیا اور لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کے لیے انھیں مکان میں چھوڑ دیا۔ غزوہ بدر، غزوہ احد

اور غزوہ، خیبر میں حضرت علیؓ کے کارنامے بہت زیادہ نمایاں تھے اور ان کی وجہ سے کفار کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔

جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری (اقبال)

خلافتِ راشدہ کے بعد بھی صراط مستقیم کی حقانیت کے لیے بے شمار واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔

اسی صراط مستقیم کی خاطر صحابہ۔ کرام نے کفار کے ہاتھوں کیسی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کے لیے مشرکین نے آگ دہکائی اور ان کو اسی آگ میں ڈال کر جلایا، لیکن آپ نے دین سے سرموانحراف نہیں کیا۔ ایک واقعہ ان کا یہ بھی ہے کہ ان کا کچھ قرضہ عاص بن وائل کے ذمے تھا، اس سے مانگا تو اس نے کہا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار جب تک نہ کرو گے، میں تمھاری رقم واپس نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا کہ جب میں مر کر دوبارہ حیات پاؤں گا اور تم میرے پاس آؤ گے تو میرے پاس وہاں مال اور اولاد سب ہی کچھ ہو گا پھر تم کو دوں گا اس موقع پر سورہ۔ مریم کی یہ آیت نازل ہوئی

"(اے میرے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا، جس نے ہماری بات کا انکار کیا اور کہا کہ میں (بروز قیامت) مال اور اولاد دیا جاؤں گا، تو کیا اس شخص نے غیب پر اطلاع پالی ہے، یا اس نے رحمٰن سے عہد و پیماں لے رکھا ہے، ہرگز نہیں، ہم اس کا یہ کہنا بھی لکھے لیتے ہیں اور اس کے لیے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور اس کی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک ہو جائیں گے وہ تو تنہا ہمارے پاس آئے گا"۔

صراط مستقیم کا ایک تقاضا اعتدال اور میانہ روی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے آخری وقت میں حضرت سعدؓ عیادت کے لیے تشریف لائے تو دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں، حضرت سعد نے کہا کہ آپ روتے ہیں، آپ اپنے ساتھیوں سے ملیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض پر آؤ گے۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ

میں موت سے گھبرا کر نہیں روتا اور نہ دنیا کی محبت کی وجہ سے روتا ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے ایک وعدہ لیا تھا کہ ہم میں سے ہر ایک کی گذر اوقات دنیا سے اتنی ہونی چاہیے جتنی کہ ایک سوار کی زاد راہ ہوتی ہے، حالانکہ حضرت سلمانؓ کا اثاثہ جو بیچا گیا وہ صرف چودہ درہم کا تھا۔ صراط مستقیم کا یہ تقاضا بھی ہے کہ ہر شخص وعدے کا سچا اور بات کا دھنی ہو۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک نوجوان نے قتل کیا تھا اور اس کی سزا یہ تھی کہ اس کو اس قتل کے بدلے قتل کیا جائے، وہ نوجوان سزا بھگتنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن ایک ماہ کی مہلت چاہتا تھا کہ وہ اپنے گھر جا کر کچھ قرضے ادا کر دے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مہلت تم کو مل سکتی ہے لیکن اسی وقت جب کہ کوئی شخص تمھاری ضمانت لے سکے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی پہچان کے اس نوجوان کی ضمانت لے لی اور وہ نوجوان چلا گیا۔ اب سب فکر مند تھے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ضمانت تو لے لی ہے، لیکن اگر وہ نوجوان وقت پر نہ آیا تو خود ابوذرؓ کو اس کے بدلے میں قتل ہونا پڑے گا۔ آخر کار وہ مقررہ دن بھی آگیا اور وہ نوجوان وقت پر واپس نہ آیا، لیکن یکایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور ایک سوار جس کا سارا بدن گرد سے اٹا ہوا تھا، مسجد کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور السلامؑ علیکم کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سب لوگ حیرت میں ہو گئے اور مقتول کے وارث اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسے معاف کر دیا۔

صراط مستقیم کی علامت تواضع اور انکسار بھی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مدائن کے گورنر تھے، ملک شام سے ایک شخص آیا، اسے حضرت سلمان راستے میں مل گئے۔ وہ ان کو پہچانتا نہیں تھا۔ وہ سمجھا کہ وہ کوئی مزدوری کا کام کرتے ہیں، چناں چہ ان کو اس نے حکم دیا کہ میرا بوجھ اٹھا کر لے چلو، حضرت سلمانؓ نے اس کا بوجھ اٹھالیا اور لے کر چلنے لگے، جب لوگوں نے دیکھا تو اس شخص سے کہا کہ یہ تو گورنر

ہیں۔اس بات پر وہ شخص معذرت کرنے لگا، لیکن آپ نے فرمایا کہ میں اس بوجھ کو اس وقت تک نہ اتاروں گا جب تک تجھے تیرے ٹھکانے پر نہ پہنچا دوں۔

صراط مستقیم معاملہ فہمی سکھاتی ہے۔حضرت امام ابو حنیفہؒ کا واقعہ ہے کہ وہ کپڑا فروخت کیا کرتے تھے۔ایک بار ان کے ایک تھان میں کوئی نقص تھا۔انھوں نے اپنے شریک کار کو ہدایت کی کہ جب یہ تھان بیچو تو اس کا عیب ضرور بتا دینا، وہ بھول گئے اور کپڑوں کے سارے تھان فروخت کر دیے۔انھیں یہ خیال نہ رہا کہ عیب والا تھان کون سا تھا اور کس کو فروخت کیا۔حضرت امام ابو حنیفہؒ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے سارے تھان کی قیمت خیرات کر دی۔

صراط مستقیم یہ بھی سکھاتی ہے کہ دین کی بات نرمی سے بتاؤ، ایک مرتبہ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسین نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا کہ اس نے صحیح طریقے پر وضو نہیں کیا، حضرت امام حسینؓ اس کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ بابا آپ ہمارا فیصلہ کر دیں میں حسن ہوں اور یہ میرا بھائی حسینؓ ہے۔یہ کہتا ہے کہ میرا وضو کا طریقہ صحیح ہے اور میں کہتا ہوں کہ میرا طریقہ صحیح ہے۔آپ ہم دونوں کا وضو دیکھ کر فیصلہ فرما دیں کہ ہم میں سے کس کا وضو صحیح ہے،چناں چہ ان دونوں شاہزادوں نے اس بوڑھے شخص کے سامنے وضو کیا اور اس طریقے سے اس بوڑھے کی اصلاح کر دی اس لیے کہہ سکتے ہیں:

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

تحمل اور بردباری

تحمل اور بردباری کی تعریف یہ ہے کہ کسی ناگوار بات کو انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے بھی برداشت کیا جائے اور کسی طرح کا بغض اپنے دل میں نہ رکھا جائے۔ یہ وصف ان فضائل میں شمار ہو جاتا ہے جس سے خود اللہ متصف ہے۔ قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر یہ وصف اللہ نے اپنے لیے بھی مخصوص کیا ہے۔ **واللہ غفور حلیم o (بقرہ) . ان اللہ غفور حلیم o (آلِ عمران) . ان اللہ کان حلیماً غفوراً o (بنی اسرائیل) . وکان اللہ علیماً حلیماً o (احزاب)** وغیرہ۔ متعدد آیات میں یہ وصف مذکور ہے۔ سورہ التغابن میں ہے کہ "اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح تو وہ اس کو دونا کر دے گا اور تمھیں معاف کر دے گا اور اللہ ہی قدر دان اور تحمل والا ہے"۔ یعنی قدر دانی تو یہ ہوئی کہ ایک کے بدلے میں دوگنا دے گا اور تحمل یوں ہے کہ اللہ نیکی والے کے تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس آیت سے تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ راز بھی سمجھایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ قصور والے کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس کے عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظرانداز ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ کسی شخص سے ایک غلطی ہوتی ہے اور اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی تو ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر

دانی سے اس کی غلطی سے در گذر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چناں چہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ اپنے بندے کی مخلصانہ خیرات کی قدر فرما کر اس کی غلطی سے در گذر فرماتا ہے۔

اللہ کا یہ وصف اس کے برگزیدہ بندوں پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف میں سورہ ہود میں فرمایا ہے کہ "بے شک وہ ابراہیمؑ بردبار، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے"۔ پھر ان کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق بھی فرمایا کہ "ہم نے ان کو (یعنی ابراہیم علیہ السلام کو) ایک بڑے بردبار بیٹے (یعنی اسماعیل علیہ السلام کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی"۔

اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے تحمل اور بردباری کے واقعات بھی سن لیجیے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ "حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا، الا یہ کہ کسی نے احکام الہیٰ کی تفضیح کی ہو"۔

طائف کے وہ رؤسا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو لہولہان کر چکے تھے، بہت تحقیر آمیز برتاؤ کر چکے تھے، لیکن ۹ھ میں جب ان لوگوں کے وفد نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا تو آپؐ نے ان کو مسجد کے صحن میں مہمان اتارا اور ان کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آئے۔ قریش کے مظالم بھی کچھ کم نہ تھے۔ ان لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا، گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستے میں کانٹے بچھائے، جسم اطہر پر نجاست پھینکی، اوجھ پھینکی، گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، (معاذ اللہ) آپؐ کو جادوگر کہا، پاگل کہا، شاعر کہا، افتراپرداز کہا، لیکن آپؐ نے ہمیشہ تحمل اور عفو سے کام لیا۔

ابو جہل آپؐ کے پیچھے پیچھے چلتا تھا، آپؐ پر خاک اڑاتا تھا اور لوگوں سے کہتا تھا کہ اس شخص کی باتیں تم لوگوں کو دین سے برگشتہ کر دیں گی، تم کو تمھارے دیوتاؤں سے چھڑوا دیں گی۔ ایسے الفاظ کو سن کر آپؐ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور

تحمل کے ساتھ دین کی تبلیغ میں سرگرم رہتے تھے۔

منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی نے **افک** کے معاملے کو خوب اچھالا، لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود قدرت کے اس سے کوئی انتقام نہیں لیا، بلکہ جن بزرگوں نے لوگوں پر صلہ رحمی نہ کرنے کی قسم کھائی ان کو بھی اللہ نے عفو درگذر کی تعلیم دی۔ سورہ النور میں فرمایا کہ "تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضیلت اور صاحبِ مقدرت ہیں ان کو یہ قسم نہیں کھانی چاہیے کہ وہ اپنے قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں مہاجروں سے سلوک نہ کریں گے۔ تم کو عفو اور درگذر سے کام لینا چاہیے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے اور اللہ غفور رحیم ہے"۔

زیدؓ بن سعنہ جب یہودی تھے اس وقت لین دین کا کام کرتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، ابھی قرض ادا کرنے کی میعاد باقی ہی تھی کہ وہ تقاضا کرنے آگئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک پکڑ کر کھینچی، سخت سست کہا اور یہ بھی کہا کہ "اے عبدالمطلب کے خاندان والو، تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو"۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "او اللہ کے دشمن! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے"۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا "اے عمرؓ! تم سے کچھ اور امید تھی، تمھیں چاہیے تھا کہ تم اس کو سمجھاتے کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے یہ کہتے کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں"۔ یہ فرما کر آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ قرض ادا کر کے بیس صاع کھجور بھی اسے دے دو۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ دس سال تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے۔ بیان کرتے ہیں کہ (اس مدت میں) آپؐ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ اس نے یہ کام کیوں کیا یا یہ کیوں نہیں کیا؟ یہی حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ

ایک دفعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کسی کام سے بھیجنا چاہا تو میں نے کہا کہ نہ جاؤں گا۔ آپؐ چپ رہ گئے۔ میں یہ کہہ کر باہر چلا گیا اور کھیل میں لگ گیا۔ دفعتاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے آکر میری گردن پر اپنا دستِ مبارک رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو آپؐ تبسم فرما رہے تھے۔ پھر آپؐ نے بڑے پیار سے فرمایا کہ انسؓ جس کام کے لیے تم سے کہا تھا، اب تو جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا، اچھا جاتا ہوں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکلے تو ایک بدو آیا اور اس نے آپؐ کی چادر مبارک اس زور سے کھینچی کہ آپؐ کی گردن سرخ ہو گئی۔ آپؐ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا کہ میرے اونٹوں کو اپنے غلے سے لاد دے۔ تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے"۔ آپؐ نے فرمایا کہ "پہلے میری گردن کا بدلہ دو، تب غلہ دیا جائے گا"۔ لیکن وہ بار بار یہ کہتا تھا کہ "خدا کی قسم میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں اور ایسے شخص کے لیے لدوا دیں جس نے گردن کھینچی تھی اور جو خود ہوس کا بندہ تھا کہ آپ سے مال وصول کر رہا تھا اور کس بدتمیزی سے بات کر رہا تھا کہ "تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے"۔

سبحان اللہ! آپؐ کی بردباری کی یہ کس قدر بلند شان تھی۔

دشمن سے انتقام لینا انسانی قانون میں فرض ہے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و درگذر، حلم و بردباری کی سب سے اعلیٰ شان اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ فتح مکہ کے دن آپؐ نے اپنی پوری قوت اور طاقت کے باوجود کسی سے انتقام نہیں لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ "آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ یہ اعلان ان سب کے لیے تھا، جن میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے حضورؐ کی راہ میں کانٹے بچھائے تھے، حضورؐ پر گندگی پھینکی تھی، گالیاں دی تھیں، طرح طرح کے بہتان

باندھے تھے، لہولہان کیا تھا اور جس قدر مخالفت ان کے بس میں تھی سب کچھ کر گزرے تھے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شان کے ساتھ عفو و در گذر کا اعلان کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا اور اسلام کے قوتِ بازو یعنی حضرت امیر حمزہؓ کا قاتل وحشی نام کا تھا۔ وہ مکہ میں رہتا تھا۔ فتح مکہ کے وقت وہ بھاگ کر طائف چلا گیا، لیکن جب طائف بھی اسلام کے زیر نگیں آگیا اور وحشی کے لیے کوئی جائے امن نہ رہی تو وہ ناچار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام لے آیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس قدر فرمایا کہ "میرے سامنے نہ آیا کرو کہ تم کو دیکھ کر مجھے اپنے چچا کی یاد آتی ہے"۔

ابو سفیان کی بیوی ہندہ جس نے حضرت امیر حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا، جب حضور انور صلی اللہ وسلم پر ایمان لائی تو بے اختیار بول اٹھی کہ "یا رسول اللہ! آپؐ کے خیمے سے زیادہ برا خیمہ میری نگاہ میں کوئی اور نہ تھا، لیکن آج آپؐ کے خیمے سے زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں کوئی اور نہیں"۔

ابو سفیان نے بدر سے لے کر فتح مکہ تک ہر موقع پر اسلام سے دشمنی کی تھی، لیکن جب وہ فتح مکہ کے موقع پر گرفتار ہو کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوئے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ان کے گذشتہ جرائم کی پاداش میں ان کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضورؐ نے منع فرمایا، بلکہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا۔ یعنی فرمایا کہ "جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا (بھی) قصور معاف ہو جائے گا"۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و تحمل کی کس قدر بے نظیر مثال ہے!

آپؐ نے اسی شان کی بدولت دشمنوں کو نہ صرف دوست بلکہ اپنا جاں نثار بنا لیا تھا۔ سورہ حٰم سجدہ میں ہے "اور بھلائی برائی برابر نہیں۔ اگر کوئی برائی کرے تو اس

کا جواب اچھائی سے دو، پھر تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست ہے ناتے والا، اور یہ بات ملتی ہے ان کو جن کو صبر ہے۔ اگر اس میں شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ۔ بے شک وہی ہے سنتا جانتا"۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "اللہ نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب کے وقت میں صبر کا، نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلے میں عفو و درگزر کا حکم دیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھے گا"۔

اس سلسلے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بھی ہے، فرمایا کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص باوجود قدرت کے غصے کو ضبط کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا"۔ غصے کو ضبط کرنا، حلم و بردباری کے لیے لازمی چیز ہے۔ اسی طرح عفو و درگزر، رفق و ملاطفت، صبر و سکون بھی اس وصف کے لازمی عناصر ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے متعلق فرمایا کہ "تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے، یعنی (۱) حلم اور (۲) جلد بازی نہ کرنا۔ یہ پسندیدہ خصلتیں اسی لیے محمود و مقبول ہیں کہ ان کی وجہ سے غصہ قریب نہیں آنے پاتا اور ہر چیز سنجیدگی سے سمجھی اور پرکھی جا سکتی ہے۔

اللہ کے محمود و مقبول بندوں کی تعریف میں سورہ الشوریٰ میں یہ آیتیں ہیں:

"اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسا کرتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورے سے ہوتے

ہیں اور ہم نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر حملہ ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ تو جو معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر ازخود ظلم کرتے ہیں اور زمین پر ناحق فساد مچاتے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اور بیشک جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کر دے اور برداشت کر لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔ ان آیات میں بھی تحمل و بردباری، عفو و درگزر، احسان و ایقان کی تعریف ہے جو آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بہتان باندھنا

بہتان کیا ہے ؟ اس کا ذکر ایک حدیث شریف میں غیبت کے ذیل میں اس طرح آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا " تمھارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے " ۔ عرض کیا گیا کہ " اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں " تو فرمایا " اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر (وہ عیب) موجود نہیں تو تم نے اس پر بہتان باندھا " ۔ بہتان چہ کسی کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کرنا بہتان بھی ہے اور جھوٹ بھی ہے اور اس عیب کو قرآن میں خیانت بھی کہا ہے ۔ سورہ نساء میں آیا ہے کہ

> " ہم نے (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) آپؐ کی طرف یہ سچی کتاب نازل کی ہے کہ آپؐ لوگوں کے درمیان اس کے ذریعے ، جو اللہ نے آپؐ کو سمجھایا ہے ، انصاف کریں اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑیں اور اللہ سے قصور معاف کرائیں ۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے ۔ اور ان کی طرف سے آپؐ نہ جھگڑیں جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں ۔ بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کار گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا ۔ وہ لوگ عامتہ الناس سے چھپانا چاہتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ تو ان کے ساتھ ہی ہے جب رات کو وہ لوگ سازش کرتے ہیں ، جو اللہ کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے

ہوئے ہے"۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ گناہ گار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہ گار ٹھہرانا اللہ پاک کے نزدیک کس قدر ناپسندیدہ چیز ہے۔ سورہ نساء میں آگے چل کر آتا ہے کہ

"اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے، پھر وہ اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے اس نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا"۔

ان آیتوں میں تہمت تراشی کی برائی ظاہر کی گئی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو انصاف کی تاکید کے بعد حکم ہے کہ خیانت کرنے والوں کی حمایت اور ان کی طرف سے کسی طرح کی وکالت نہ کی جائے۔ پھر فرمایا کہ جو لوگ ایسے خائن ہیں وہ بڑے گناہگار ہیں اور وہ اللہ کی محبت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈال دیتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے اور ان کے ہر قول و فعل کو دیکھ رہا ہے۔ اگر صرف اتنا ہی یقین راسخ ہو جائے تو کوئی شخص کسی پر بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ جس شخص نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپ دیا تو اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر لادا۔ سورہ الاحزاب میں بھی ایسے لوگوں کے لیے وعید آئی ہے جو خواہ مخواہ دوسرے لوگوں کے سر کوئی بہتان تھوپ دیتے ہیں اور ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

"اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر کیے ہوئے (کسی برائی کی تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں، انھوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا"۔

کسی شخص پر خواہ مخواہ الزام لگانا اور اس کو تکلیف پہنچانا خود انسانیت کی توہین ہے، کیوں کہ اس طرح انسانیت اور اس کا معاشرہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور ایک جھوٹے الزام سے کس قدر دوسری برائیاں پیدا ہوتی ہیں، یعنی حسد، بغض، دشمنی اور انتقام وغیرہ کے جذبات ابھرتے ہیں اور انسان انسان نہیں رہتا۔

اسلام نے بہتان طرازی کو بہت بڑا گناہ ٹھہرایا ہے۔

حکم آتا ہے کہ جو شخص بھی بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے تو اس کو اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں۔ سورہ النور میں فرمایا ہے کہ اور جو لوگ شریف عورتوں کو عیب لگاتے ہیں پھر نہ لائے چار گواہ تو ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو اور وہ فاسق ہیں۔ مگر جنھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کی، سو اللہ تعالیٰ ضرور مغفرت کرنے والا، رحمت کرنے والا ہے۔ سورہ الشعراء میں بھی بہتان باندھنے والوں اور غلط قسم کی شاعری کرنے والوں کے لیے وعید آئی ہے۔ ارشاد ہے کہ کیا تم کو بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں؟ وہ اترتے ہیں بہتان باندھنے والے گناہگاروں پر جو کان لگا کر سنتے ہیں اور ان میں اکثر جھوٹے ہیں اور شاعروں پر جن کی پیروی گمراہ کرتے ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ وہم و خیال کی وادی میں پریشان پھرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔ مگر وہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو اکثر یاد کرتے رہے اور انتقام لیا اس کے بعد جب کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

اسلام میں قول و فعل دونوں کی سچائی کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ورنہ وہ دین جو اس صداقت سے عاری ہو حزب اللہ کا دین نہیں ہو سکتا اور ایسے دین سے معاشرے کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ سورہ الزمر میں فرمایا ہے کہ "بیشک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے، احسان نہیں مانتا" ۔ چناں چہ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے، بلکہ ایسے لوگوں پر بھی لعنت آئی ہے جو حق کا علم رکھتے ہوئے بھی حق کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ سورہ البقرہ میں ہے کہ "بے شک جو چھپاتے ہیں صاف حکم اور ہدایت کے نشان جو ہم نے اتارے ہیں، اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لیے کھول کر کہہ دیا ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں"۔

جھوٹ بولنا اور جھوٹا عمل پیش کرنا۔ایک مہذب قوم کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور ایسے عمل سے جس قدر نقصانات کا امکان ہے وہ بیان سے باہر ہے۔یعنی وہ قومیں جو دین سے بے تعلق ہیں، اگر اپنے عمل میں صحیح نہیں ہیں اور لوگوں کو اپنی فریب کاریوں کا شکار بناتی ہیں، وہ کتنے دن زندہ رہ سکتی ہیں ؟ جھوٹ، فریب، دورخا پن، منافقت وغیرہ تمام رذائل بہتان سے بہت قریب ہیں۔بہتان تو جھوٹ باندھنے ہی کو کہتے ہیں۔اس کا مقصد فریب ہوا کرتا ہے اور اسی سے دورخا پن اور منافقت کے لیے راہیں کھلتی ہیں۔

سورہ الحجرات میں ارشاد فرمایا ہے کہ "اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو، کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو، کہ پھر اپنے کیے پر پچھتانے لگو"۔یہ ایسی تنبیہ ہے کہ جس سے فاسق کے فسق اور بہتان کی قلعی کھل جاتی ہے اور غلط خبر یا بہتان سے جو غصہ اور جوش پیدا ہو سکتا ہے اس سے ابا بھی کیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ جس چیز میں اصلیت ہی نہیں ہے اس سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"**افک**" یعنی جھوٹ باندھنا ایک ایسا قبیح فعل ہے کہ جس سے پورا معاشرہ اور اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔اس لفظ کی مناسبت سے ابو افک کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔یہ ایک ہجو نگار شاعر تھا اور عمرو بن عوف کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا تھا، ہجو لکھتا تھا اور جھوٹ باندھتا تھا۔اس کے جھوٹ اور افترا پردازی سے کافروں میں مسلمانوں کے خلاف جوش پیدا ہوتا تھا اور وہ لوگ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔جنگ بدر کے بعد حضرت سالم بن عمیر رضی اللہ عنہ نے عہد کیا کہ ابو افک کا خاتمہ کیا جائے۔چناں چہ ایک دن آپؓ تن تنہا اس کے قبیلے میں تشریف لے گئے اور اسے تلوار سے دو ٹکڑے کر دیا۔اس طرح اسلام اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے والے کا خاتمہ ہوا۔

بہر حال بہتان تراشی اور افترا پردازی ایک ایسی معصیت ہے جس کے مرتکب کے لیے سورہ النور میں سخت عذاب کی وعید ہے کہ "ان کے لیے دنیا میں دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔ اور ایسے لوگوں کو اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیب جوئی، بہتان تراشی اور آبرو ریزی کو سختی سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ "ایک مسلمان کی ساری چیزیں دوسرے مسلمان پر حرام ہیں۔ اس کی جان اور اس کا مال اور اس کی آبرو"۔ یعنی نہ اس کی جان کو تکلیف دینا جائز ہے، نہ اس کے مال کا نقصان کرنا اور نہ اس کی آبرو کو صدمہ پہنچانا۔ مثلاً اس پر بہتان باندھنا، اس کا عیب کھولنا یا اس کی غیبت کرنا وغیرہ۔

اللہ پاک، ہم سب کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

ایمان

ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اور مصدر متعدی ہے جس کے معنی ہیں "امن کر دینا" یا "امن دینا"۔ اسی لیے اللہ پاک کا ایک اسم "المومن" ہے، یعنی "امن دینے والا"، جو تمام عالم کو امن اور ہر شخص کو خیر و فلاح پہنچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم ماننے کو ایمان کہتے ہیں اور جو شخص اس کا حکم مانتا ہے وہ مومن کہلاتا ہے۔ چناں چہ صحیح مومن وہ ہے جو نیک ہو، برائیوں سے دور ہو، امن پسند ہو، امن رساں ہو اور اس کے ذریعے کوئی برائی نہ پھیلے۔ مسلمانوں میں ایمان کی اصطلاح اس معنی میں عام ہے کہ زبان سے اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا جائے، پھر دل سے اور عمل سے اس اقرار کی تصدیق بھی کی جائے۔ ایک حدیث ہے کہ "ایمان کے معنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ہو اور نماز قائم کی جائے"۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ:

لا الہ الا اللہ کے معنی ہیں کہ "سوائے اللہ کے کسی کے آگے سر نہ جھکایا جائے" اور محمد رسول اللہ کے معنی ہیں کہ "سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور کی پیروی نہ کی جائے۔"

علمائے حق نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان یہ ہے کہ "اس کی معرفت اور محبت حاصل کرنے کو ہم اپنی زندگی کا مقصد بنا لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچا ایمان یہ ہے کہ صرف انؐ کے نقش قدم پر چلیں اور قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ

زندگی کے تمام کاموں میں اسے مشعل ہدایت بنائیں۔اسی طرح آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ہر کام کا ایک لازمی نتیجہ مرنے کے بعد ملنے کا یقین ہو"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی اصل چھ (۶) چیزیں قرار دی ہیں؛ (۱) اللہ پر ایمان لانا۔(۲) اس کے فرشتوں پر ایمان لانا۔(۳) اس کی کتابوں پر ایمان لانا (۴) اس کے رسولوں پر ایمان لانا۔(۵) قیامت کے دن پر ایمان لانا اور (۶) تقدیر پر ایمان لانا۔"ایمان مفصل" یہی ہے۔

سورہ البقرہ (آیت ۲۸۵) میں بھی اس طرح ارشاد ہے:

"رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایمان لائے ان باتوں پر جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اتاری گئیں اور مومن لوگ بھی (ایمان لائے)۔سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔(وہ کہتے ہیں کہ) ہم جدا نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی کو، اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سنتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں۔اے ہمارے رب ہمیں اپنی بخشش عطا فرما کہ تیری طرف لوٹنا ہے"۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں شریعتِ محمدیہ کی ظاہری صورت کو قبول کرنا بھی ایمان ہے اور زبان سے اور دل سے اقرار کے ساتھ اعضاء کے عمل سے بھی ایمان قبول کرنا ضروری کہا گیا ہے۔سورہ یوسف (آیت ۱۰۶) میں ہے کہ: "اور ان میں اکثر وہ ہیں کہ اللہ پر یقین نہیں لاتے مگر شرک کرتے ہوئے"۔

یہ آیت جمہور کے نزدیک مشرکین کے رد میں ہے جو اللہ تعالیٰ کو خالق اور رزاق مانتے ہوئے بھی غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کو اللہ مانتے ہوئے بھی اس کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔

صرف یقین اور اعتبار کرنے کے معنی میں بھی ایمان کا لفظ قرآن پاک میں آتا

ہے۔ مثلاً سورہ یوسف (آیت ۱۷) میں یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دینے کے بعد ان کے بھائیوں کے مکالمے کا ذکر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

" (اے ہمارے باپ) آپ کسی طرح ہمارا یقین نہ کریں گے اگرچہ ہم سچے ہوں "۔ اس آیت میں " **وما انت بمؤمن لنا** " اسی معنی میں ہے۔ سورہ البقرہ (آیت ۱۴۳) میں ہے: " اللہ کی شان نہیں کہ تمھارا ایمان اکارت کر لے " یہاں ایمان سے مراد نماز ہے۔ آیت کی شان نزول یہ ہے کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کے زمانے میں جن صحابہؓ نے وفات پائی، ان کے رشتہ داروں نے تحویل قبلہ کے بعد ان کی نمازوں کا حکم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ نے اطمینان دلایا کہ ان کی نمازیں ضائع نہیں ہوئیں، ان پر ان کو اجر ملے گا۔

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

محققین کی رائے یہ ہے کہ اصل ایمان یا حقیقت ایمانیہ صرف یقین قلبی کا نام ہے اور ایمان کامل وہ ہے جو (۱) یقین، (۲) اقرار اور (۳) عمل کا مجموعہ ہے اور اصل ایمان دوزخ میں ہمیشہ رہنے سے مانع ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بڑی تفصیل سے ایمان پر بحث کی ہے۔ ان انھوں نے بتایا ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس پر احکام دنیا کا مدار ہے، جیسے (ایمان کی وجہ سے) جان و مال کا محفوظ رہنا، کیوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ " جو ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کو قبلہ سمجھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا معاہدہ ہے۔ پس تم لوگ اللہ کے معاہدے میں خیانت نہ کرنا "۔

شاہ ولی اللہؒ نے ایمان کی دوسری قسم جو بتائی ہے وہ ہے، جس پر آخرت کا مدار ہے، جیسے نجات اور حصول درجات۔ شاہ صاحبؒ نے پھر ایمان کی ایک تیسری قسم بتائی ہے، یعنی اللہ تعالی، اس کے فرشتے، کتابوں اور رسولوں وغیرہ پر ایمان لانا اور دل

سے تصدیق کرنا۔

ایمان اور اسلام یوں تو ایک ہی معنی میں ہیں لیکن فرق بھی ہے۔ اسلام کے اصل معنی ہیں "اپنے آپ کو کسی کے (یعنی اللہ کے) حوالے کر دینا"۔ اسی لیے مسلمان وہ ہے جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے اور اس کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ یہی چیز خدا کی فرمانبرداری کہلاتی ہے اور اسی کی تعلیم کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے گئے، یعنی "**ان الدین عند الله الاسلام**" (اللہ کے نزدیک دین، اسلام ہی ہے)۔ لیکن قرآن پاک میں ایک جگہ ظاہری اظہار اطاعت کو بھی اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی ایسی اطاعت کا اظہار جو دل سے نہ ہو۔ سورہ الحجرات (آیت ۱۴) میں ارشاد ہے:

"گنوار لوگ بولے، ہم ایمان لائے۔ آپؐ فرما دیں کہ تم لوگ ایمان نہیں لائے، مگر یہ کہو کہ ہم اسلام لائے۔ حالت یہ ہے کہ ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے"۔

اس آیت میں ظاہری تسلیم کے معنی میں اسلام کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی وہ تسلیم جو دل سے نہ ہو، صرف زبان سے ہو اور وہ تسلیم جو احکام خداوندی پر عمل کے لیے آمادہ نہ کرے۔

اس خصوصی معنی کے علاوہ ایمان اور اسلام ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ سورہ آل عمران (آیت ۸۵) میں ارشاد ہے:

"اور جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارے میں رہے گا"۔

پھر ایک مسلمان کی شان اللہ پاک نے سورہ الانعام (آیت ۱۶۳-۱۶۴) میں اس طرح بیان فرمائی ہے:

"آپؐ فرما دیں کہ بے شک میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا

اللہ ہی کے لیے ہے، جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں (یعنی اللہ کا فرمابردار ہوں)"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی ہماری نماز، ہماری عبادت، ہمارا جینا اور ہمارا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے یا غیر اللہ کے لیے ہے۔ اللہ پاک ہماری حالت پر رحم فرمائے۔ آمین ثم آمین

فرض شناسی

فرض کے لغوی معنی ہیں کسی سخت چیز کو کاٹنا اور اس میں اثر کرنا ۔ اسی مناسبت سے اس کے مختلف معانی پیدا ہوگئے، جن میں سے ایک معنی ہمارے موضوع سے متعلق یہ ہے کہ کوئی کام اپنے اوپر لازم کر لینا اور فرض شناسی یہ ہے کہ جو چیز لازمی اور ضروری ہو اس کو پہچاننا اور اس کو اختیار کرنا ۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فرض شناسی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ وہ انسان ہی کیا جو یہ نہ جانے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کس سے گریز کرنا ضروری ہے ۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو فرض شناسی یہ ہے کہ پیدا کرنے اور پالنے والے کو پہچانے ۔ رب العلمین کا شکر ادا کرے، اسے ایک جانے، اسے بے نیاز سمجھے اور تمام قوتوں کا سرچشمہ سمجھ کر صرف اس کے آگے جھکے ۔ انسان کچھ نہیں تھا تو ہو گیا اور اب ہے تو کچھ وقت بعد نہ رہے گا ۔ سورہ الدہر (آیت ۱) میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"بے شک انسان پر ایک وقت ایسا گزرا کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا" ۔

یعنی وہ نیست تھا تو جس ذات نے اسے ہست کیا ہے اسے پہچاننا، اس کا احسان ماننا اور اس کے احکام پر عمل کرنا سب سے پہلی فرض شناسی ہے ۔ اللہ پیدا کرتا ہے، وہ رزق دیتا ہے کہ

"کوئی ذی روح دنیا میں ایسا نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے اپنے اوپر نہ لیا ہو" ۔ (سورہ ہود، آیت ۶)

خواہ کوئی اسے مانے یا نہ مانے، کوئی اسے اچھے الفاظ سے یاد کرے یا برے

الفاظ سے پکارے، وہ رزق دے گا اور اس نے "اپنے ذمے رحمت لازم کر لی ہے"۔ (سورہ انعام۔۴۶)

اللہ کے بعد انسان کا فرض ہے کہ وہ سب سے بڑے محسن انسانیت یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانے اور ان کا احسان مانے، کیوں کہ صرف ان کے طفیل ہی اسے "کامل دین" اور اللہ کی نعمت پوری کی پوری حاصل ہوئی ہے۔(سورۂ المائدہ، آیت ۳)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا ہی اصل دین ہے اور اسی پیروی سے اللہ کی محبت اور مغفرت حاصل ہوتی ہے۔ سورہ آل عمران (آیت ۳۱) میں ارشاد ہے کہ

"آپؐ فرما دیں، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

یہ تو ہیں وہ حقوق جو بندے پر اللہ پاک اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عائد ہوتے ہیں، لیکن اگر بندہ یہ حقوق ادا نہ کرے تو اللہ کو اس کی پروا نہیں ہے۔ مگر اللہ کو اپنی رحیمی اور کریمی سے اس بات کی ضرور پروا ہے کہ بندوں کے حقوق ادا کیے جائیں، تاکہ بندوں ہی کا فائدہ ہو اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سنور جائے۔ اسی لیے وہ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ سورہ النحل (آیت ۹۰) میں ارشاد ہے کہ

"بے شک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف کرنے اور نیکی کرنے کا اور رشتہ داروں کو دینے کا"۔

اور ان رشتہ داروں میں سب سے پہلے ماں باپ کے حقوق ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل (آیت ۲۳و۲۴) میں اس طرح ارشاد ہے کہ

"اور تمہارے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کو اف بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو۔ اور ان سے تعظیم کی بات کہنا اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھانا نرم دلی کے ساتھ۔ اور دعا کرنا کہ اے رب، ان پر رحم فرما جس طرح بچپن میں انھوں نے میری پرورش کی ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں اولاد کو ان کی فرض شناسی سکھائی جارہی ہے، تاکہ سب سے پہلے ان کے گھر کا نظام درست ہو اور گھر میں محبت اور اتفاق کی برکت حاصل ہو۔ پھر اسی سورہ بنی اسرائیل میں بہت سے حقوق کے لیے احکام اتے ہیں، تاکہ فرض شناسی کی بدولت انسان کا معاشرہ بہتر سے بہتر ہو جائے۔ والدین کے حقوق کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "اور رشتہ داروں کو ان کا حق دینا مسکین اور مسافر کو اور فضول نہ اڑانا"۔ (آیت ۲۶)

عزیزوں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق اسی لیے ادا کرنے کے احکام ہیں کہ خود ہم اور ہمارا معاشرہ درست ہوسکے، تکلیفیں دور ہوں، باہمی اتفاق اور اخلاص پیدا ہو اور زندگی کو اعتدال اور توازن حاصل ہو۔ اسی آیت کے بعد اعتدال پر زور دیا گیا ہے کہ

"اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ پورا کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کیا ہوا اور تھکا ہوا"۔ (آیت ۲۹)

یعنی نہ اپنے ہاتھ کو روک رکھو کہ بلکہ خرچ نہ کرو اور نہ ایسا خرچ کرو کہ خود تمہارے پاس کچھ نہ بچے۔ اس آیت کے بعد خاندانی منصوبہ بندی (Family Planning) والوں کے لیے ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو مفلسی کے ڈر سے ۔ ہم انھیں
بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی ۔ بے شک ان کا قتل بہت بڑی خطا
ہے"۔ (آیت ۳۱)

اس کے بعد ہی وہ آیت آتی ہے جس میں آج کل کی تہذیب کے دعوے داروں کی مذمت ہے، جو ایک سے زیادہ شادی کرنے کو برا سمجھتے ہیں، لیکن ناجائز تعلقات کی درپردہ حمایت کرتے ہیں ۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور بدکاری کے پاس نہ جاؤ ۔ بے شک وہ بے حیائی ہے اور
بہت ہی بری راہ ہے"۔ (آیت ۳۲)

یہاں اس فرض شناسی کی تعلیم دی گئی ہے جس کو ملحوظ رکھنے سے بکثرت معاشی برائیاں دور ہو سکتی ہیں ۔ پھر اسی سورت میں اور اسی سلسلے میں قتل کی مذمت ہے کہ قاتل کس بیدردی سے دوسرے کو قتل کرتا ہے اور پھر جب پکڑا جاتا ہے اور خود قتل ہونے لگتا ہے تو رحم کی اپیلیں کرتا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور کسی جان کو جس کی حرمت اللہ نے رکھی ہے ناحق نہ
مارو اور جو ناحق مارا جائے گا تو بے شک ہم نے اس کے وارث کو قابو
دیا"۔ (آیت ۳۳)

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس راہ سے جو احسن ہو"۔ (آیت ۳۴)

یہ ارشاد ایسے لوگوں کے لیے ہے جو یتیموں کو کمزور جان کر ان کا مال ہڑپ کرنے میں دریغ نہیں کرتے ۔ پھر ان لوگوں کو فرض شناسی سکھائی جارہی ہے جو ناپ تول میں اور ملاوٹ کے لیے ہر بے ایمانی کو اپنا ایمان سمجھنے لگے ہیں ۔ ارشاد ہے کہ

"اور ناپ تول کرو تو پورا پورا کرو اور برابر ترازو سے تولو ۔
یہی بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے"۔ (آیت ۳۵)

ہم لوگ جھوٹی گواہی دینے اور جھوٹے بیانات دینے کو ایک فن سمجھنے لگے ہیں، بلکہ عدالتوں میں جھوٹی گواہی دینے والے کرایہ پر بھی مہیا ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف سخت حکم ہے کہ

"اور اس بات کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان سب سے سوال ہونا ہے"۔ (آیت ۳۶)

یہ فرض شناسی، انصاف اور حق گوئی کی تعلیم کے لیے سکھائی جا رہی ہے۔ پھر شان اور اکڑ دکھانے والوں کی مذمت آئی ہے کہ

"اور زمین پر اترا کر نہ چل۔ بے شک تو ہرگز زمین کو چیر نہ ڈالے گا اور بلندی میں ہرگز پہاڑوں کو نہ پہنچے گا"۔ (آیت ۳۷)

یہ ہماری جھوٹی شان اور دکھاوے کی چال کے خلاف ارشاد ہے اور یہی وہ سورہ مبارکہ ہے جس میں مسلسل احکام صرف فرض شناسی سے متعلق ہیں اور اللہ پاک نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ

"یہ سب باتیں جو بری ہیں تمھارے رب کو ناپسند ہیں"۔ (آیت ۳۸)

یعنی ان برائیوں سے فرد اور جماعت دونوں کا نقصان ہے اور وہ اللہ جس کو اپنے بندوں کی تکلیفیں پسند نہیں ہیں وہ ان برائیوں کو بہت ناپسند کرتا ہے۔ کیوں کہ ان سے پورا انسانی معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے اور دنیا کی وہ قومیں جو اپنی تہذیب پر ناز کرتی ہیں ان برائیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے زیادہ پریشان ہیں۔

شریعت نے حقوق و فرائض اور اخلاقی فضائل اور رذائل کی تخصیص اور تفریق اسی لیے کی ہے کہ انسان اپنی زندگی میں اچھے برے کی تمیز کر سکے۔ زبان کی سچائی، دل کی سچائی، عمل کی سچائی، سخاوت، عفت، دیانت، امانت، شرم و حیا، رحم و کرم، عدل و انصاف، عفو و درگذر، حلم و بردباری، لطف و احسان، تواضع و انکساری، ایثار و قربانی، اعتدال و میانہ روی، خودداری اور عزت نفس، شجاعت و شہادت، استغناء اور

استقامت وغیرہ فضائل کی تحسین و توصیف اور ان پر تعمیل کی تاکید صرف اس لیے ہے کہ انسان کو فرض شناس بنایا جائے اور ان فضائل کے خلاف تمام برائیوں سے پرہیز سکھایا جائے، تاکہ وہ خود اپنی ذات کے لیے اور حیاتِ انسانی کے لیے تکلیف دہ نہ بن جائے، بلکہ موجب رحمت و برکت ہو۔ اللہ پاک نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ:

" **ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا .....** "، یعنی " اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنا بھلا کرو گے اور اگر برا کرو گے تو اپنا " ۔ (سورہ بنی اسرائیل، آیت ۷)

اللہ پاک کو ہماری بھلائی سے نہ تو بھلائی ملے گی اور نہ ہماری برائی سے برائی ملے گی ۔ ملنا اور نہ ملنا صرف ہمارے لیے ہے ۔ ہم اپنی ذمہ داری کو پہچانیں تو ہم اس منصب پر پہنچ سکتے ہیں جس کا شرف بخشا گیا ہے کہ

" بے شک ہم نے برتری دی آدم کی اولاد کو ۔ اور خشکی و تری میں ان کو سوار کر دیا اور عمدہ اور پاک چیزوں کی ان کو روزی دی ۔
(بنی اسرائیل، آیت ۷۰)

خدا کرے کہ ہم فرض شناس بن کر اس منصب کے اہل بن سکیں!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

فراخ دلی

فراخ دلی ایسا جامع وصف ہے جس کے ذیل میں عفو و درگذر، حلم و بردباری، ایثار و قربانی، رفق و لطف، احسان و انعام وغیرہ بکثرت فضائل آجاتے ہیں۔

فراخ دلی کی ضرورت سب سے پہلے عقائد کے معاملے میں درپیش آتی ہے۔ مثلاً ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسلامی جوش اور اس کی حمایت میں دوسروں کے خداؤں کو برا بھلا کہنے لگے۔ سورہ الانعام (آیت ۱۰۸) میں ارشاد ہے:

"اور جن کو یہ مشرک، اللہ کے سوا پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو کہ وہ بھی اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں"۔

ظاہر ہے کہ اگر ہم کسی کے معبود کو برا کہیں گے تو وہ شخص بھی ہمارے معبود کو برا کہے گا اور اس طرح فساد پیدا ہوگا، جس کی مذمت، قرآن پاک میں متعدد مقامات پر آئی ہے۔

اسی کے ذیل میں یہ بھی ہے کہ کسی غیر مسلم کے عقائد کو نہ تو مجروح کیا جائے اور نہ اس سے سختی سے معاملہ کیا جائے۔ سورہ النحل (آیت ۱۲۵) میں ارشاد ہے کہ

"تو اپنے رب کے راستے کی طرف، دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا"۔

یعنی نرمی اور محبت کے ساتھ دین کی دعوت دی جائے، کیوں کہ نرمی اور محبت ہی سے کوئی بات اثر کرتی ہے۔ سورہ النساء (آیت ۶۳) میں ہے:

"اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ دے ایسی بات جو ان کے دل تک پہنچ

جائے"۔

اسی لیے نفرت اور حقارت کرنے کے بجائے (کافروں تک کو) صراط مستقیم پر نرمی سے دعوت دے کر اپنانے کا حکم ہے۔ سورہ التوبہ (آیت ۱۱) میں ارشاد ہے کہ "پس اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں"۔

فراخ دلی، نرمی، عفو و درگذر، مروت و مؤدت وغیرہ ہی ایسے محاسن ہیں کہ جن کی وجہ سے دشمنوں کے دلوں پر بھی قبضہ کیا جاسکتا ہے اور ہر فساد کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک قتل ہی کے معاملے کو دیکھیے کہ اس کی وجہ سے کس قدر دشمنی بڑھتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قصاص کا کوئی ایسا مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا جس میں آپ نے معاف کرنے اور درگذر کرنے کا مشورہ نہ دیا ہو"۔

دیکھیے کتنی بڑی دشمنی کو دور کرنے کے لیے آپ نے حسن سلوک ہی کو ترجیح دی ہے اور اس سے زیادہ فراخ دلی اور کیا ہو سکتی ہے؟ فراخ دلی کی تعلیم کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ آپؐ نے بڑے بڑے دشمن کے لیے بھی دعا ہی فرمائی ہے۔ طائف میں آپؐ کو کفار کے ہاتھوں اس قدر اذیت پہنچی تھی کہ جنگِ احد کی تکلیف سے بھی زیادہ سخت تھی۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت جبریل علیہ السلام نے آپؐ کو پہاڑوں کے فرشتے سے ملایا۔ اس نے آپؐ کو سلام کیا اور عرض کیا کہ "اے محمدؐ! میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپؐ مجھے حکم دیں۔ اگر آپؐ چاہیں تو دونوں پہاڑوں کو ان (طائف کے) لوگوں پر لا ملاؤں (تاکہ یہ سب پس کر ختم ہو جائیں)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نہیں، بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرما دے جو صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ

کریں"۔

دیکھیے، اس وقت اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے لوگوں سے بدلہ لینا چاہتے تو بالکل آسان تھا کہ اس فرشتے کو حکم کر دیتے کہ ان لوگوں کو پہاڑوں کے درمیان پیس دیا جائے ۔ لیکن آپ رحمتہ للعالمین تھے، اس لیے ان کافروں کے لیے بھی رحمت بن گئے اور ان لوگوں کی نسل کے مسلمان ہونے کی امید ظاہر فرمائی ۔ پھر گنہگاروں کے لیے بھی آپؐ ہمیشہ رحمت تھے ۔ ایک شرابی کا واقعہ ہے کہ اسے بارہا شراب پینے کی وجہ سے سزا ہوئی، لیکن وہ باز نہ آتا تھا۔ صحابہؓ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو۔ خدا کی قسم مجھے اس کے متعلق معلوم ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے "۔ اس واقعے سے معلوم ہوا کہ گنہگار پر بھی لعنت نہ بھیجنا چاہیے کہ ممکن ہے اس کے دل میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فراخ دلی کے واقعات میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے حالات کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔

صلح حدیبیہ کا واقعہ سنہ ۰۶ ہجری کا ہے، جب کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کی نیت سے مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے اور اس وقت تک مسلمانوں کو بدر، احد اور خندق کی جنگوں میں کفارِ مکہ سے اپنی مدافعت میں لڑنا پڑا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب کہ مکہ میں غلہ نایاب تھا اور نجد کے ممتاز تاجر ثمامہ نے ان کا غلہ بند کر دیا تھا، لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر انھوں نے پھر مکہ کو غلہ بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی کفار کے ساتھ صلہ، رحمی کا یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا کہ جن لوگوں نے اتنی تکلیفیں پہنچائی تھیں ان کی تکلیفوں کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم برداشت نہیں فرما سکتے تھے ۔ ایسے احسان و انعام کے باوجود کفار مکہ نے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روک دیا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ

شرطیں منظور فرمالیں کہ
(۱) دس سال تک باہمی صلح رہے گی اور جانبین کی آمد ورفت میں کسی کو روک ٹوک نہ ہو گی۔
(۲) جو قبائل چاہیں قریش سے مل جائیں اور جو چاہیں مسلمانوں میں شامل ہو جائیں۔
(۳) آئندہ سال مسلمانوں کو طواف مکہ کی اجازت ہو گی، لیکن اس وقت ہتھیار ان کے جسم پر نہ ہوں، گو کہ سفر میں ساتھ ہوں۔
(۴) اگر قریش سے کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسلمان ہو کر چلا جائے تو اس شخص کو قریش کے طلب کرنے پر واپس کر دیا جائے گا، لیکن اگر کوئی شخص اسلام چھوڑ کر قریش سے جا ملے تو قریش اسے واپس نہ کریں گے۔

ذرا ان شرائط کو دیکھیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس فراخ دلی کے ساتھ اپنے دشمنوں سے مفاہمت فرمائی اور ان کو قبول فرما کر کس طرح عفو و در گذر کا ثبوت دیا اور انھیں کس فراخ دلی کے ساتھ غلہ بھی فراہم کیا۔

حج سنہ ۰۹ ہجری میں فرض ہوا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۱۰ ہجری میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ پہنچے تو بعض روایات کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ ساتھ تھے۔ ظاہری طاقت اور رعب وجلال کتنا ہو گا؟ لیکن عفو و در گذر، رحم و حلم، احسان اور انعام کا جو اعلان اس وقت ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، یعنی "آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ، تم سب آزاد ہو" اور معاف کیے جانے والوں مین جو لوگ تھے ان میں وحشی بھی تھا، جس نے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ ان میں ابو سفیان کی بیوی ہندہ بھی تھی جس نے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کیا تھا اور ان کے دل و جگر کے ٹکڑے چبائے تھے۔ ان لوگوں میں ابو جہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا جو باپ کی طرح اسلام کا سخت دشمن تھا۔ صفوان بن امیہ بھی اسلام لانے سے پہلے اسلام کے شدید ترین دشمنوں میں سے تھے۔ ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس نے حضور

انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو سخت اذیت پہنچائی تھی، جب وہ مکہ سے ہجرت کر رہی تھیں اور ہبار نے ان کو اونٹ سے گرا دیا تھا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ ابو سفیان نے بھی بدر سے فتح مکہ تک تمام لڑائیوں میں کفار کا ساتھ دیا تھا۔ قبیلہ بنو حنیفہ بھی ہمیشہ اسلام کا دشمن رہا۔ خود قریش نے شعب ابی طالب میں تین برس تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو محصور رکھ کر کھانے پینے تک سے محروم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و درگزر اور فراخ دلی کی وجہ سے ان لوگوں میں سے شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لے آیا ہو۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی جو جنگِ احد میں عین لڑائی کے وقت اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ مسلمانوں کو چھوڑ کر واپس چلا آیا تھا، جب وہ مرا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا۔ یہود و نصاریٰ کے لیے بھی آپؐ کی شفقتوں کے واقعات اسی طرح منقول ہیں اور یہ سب آپؐ کی رحمتِ عامہ سے متعلق ہیں اور ارشاد خداوندی بھی تو ہے کہ:

"وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین ○" (اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر)۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

رسول کریمؐ
قرآن حکیم کی نظر میں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور فضائل قرآن پاک میں کثیر تعداد میں بیان ہوئے ہیں ۔یہاں اجمالاً ہی ان کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ سورہ، آل عمران (آیت ۱۶۴) میں ارشاد ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ انھی میں سے ایک ایسے رسولؐ کو مبعوث فرمایا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ فرماتے ہیں اور ان کو قرآن کا علم اور حکمت سکھاتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے"۔

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار خصوصیات بیان فرمائی ہیں کہ (۱) وہ ان کو قرآن پہنچاتے ہیں، (۲) ان کی باطنی بیماریوں کا علاج بھی کرتے ہیں (۳) اور ان کو قرآن پاک کے مختلف علوم اور (۴) اس کی حکمتیں بھی بتاتے ہیں۔یہ علوم اور یہ حکمتیں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائی ہیں، جو چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی ہر وقت تازہ اور ہمیشہ کے لیے اٹل ہیں۔

پھر سورہ، سبا (آیت ۲۸) میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور آپ کو ہم نے نہیں بھیجا مگر سارے لوگوں کو خوشی اور ڈر سنانے کے لیے"۔

آپؐ کو سارے لوگوں یعنی تمام عالم کو ہدایت دینے اور برائیوں کے نتیجوں سے آگاہ فرمانے کے لیے بھیجا ہے۔ آپؐ سے پہلے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے وہ کسی خاص قوم، کسی خاص طبقے، کسی خاص ملک اور کسی مخصوص وقت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تمام قوموں، تمام طبقوں، تمام ملکوں اور تمام زمانوں کے لیے ہیں۔ اسی لیے سورۃ الانبیاء (آیت ۱۰۷) میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور آپؐ کو ہم نے نہیں بھیجا مگر سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر"۔

یعنی آپؐ تمام جانوں، سارے جہانوں اور کل مخلوقات کے لیے رحمت ہیں۔ بلکہ نباتات، جمادات اور ہمہ اقسام کے حیوانات کے حقوق بھی آپؐ ہی نے مقرر فرمائے ہیں اور اس طرح سب کے لیے آپؐ ہی رحمت ہیں۔

سورۃ الاحزاب (آیت ۴۰) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام انبیاء پر مہر ہیں اور تمام چیزوں کو اللہ ہی جانتا ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں یہ ارشاد بھی ملتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، یعنی آپؐ کی نرینہ اولاد مرد نہ ہونے پائے گی اور بچپن ہی میں فوت ہو جائے گی اور یہ بھی ارشاد ہے کہ آپ رسول ہی رسول ہیں اور شروع سے ہمیشہ کے لیے یہ منصب آپ کا ہے اور تمام پیغمبروں پر مہر ہیں، یعنی پیغمبری اور رسالت آپؐ کے ہاتھوں ختم ہو جائے گی۔

پھر ارشاد ہوتا ہے سورہ مائدہ (آیت ۳) میں کہ

"آج میں نے مکمل کیا تمھارے لیے تمھارے دین کو اور میں نے پوری کر دی تمھارے لیے اپنی رحمت اور پسند کیا تمھارے لیے

اسلام، دین کی حیثیت سے"۔

یعنی دین کی تکمیل اور تتمیم آپؐ کے ہاتھوں ہوئی اور یہ دلیل ہے کہ آپؐ خاتم النبیین بھی ہیں اور سب انبیاء علیہم السلام سے اکمل اور اشرف بھی ہیں۔ پھر آپؐ ہی کو اللہ پاک نے سب سے زیادہ قرب عطا فرمایا۔ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:

" پاک ذات ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات،
مسجد حرام سے مسجد اقصا تک، جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں،
تاکہ دکھلائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کے نمونے۔ بے شک وہی
ہے سنتا دیکھتا"۔

اس معراج کی تفصیل سورہ والنجم کی ابتدائی اٹھارہ آیتوں میں آتی ہے۔ ان میں سے دو کا ترجمہ یہ ہے:

" پھر رہ گیا فرق دو کمانوں کا بلکہ اس سے بھی کم۔ بہکی نہیں
(آپ کی) آنکھ اور نہ حد سے بڑھی"۔

یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ سے اتنے قریب ہو گئے کہ دو کمانوں کے فاصلے سے بھی کم فاصلہ رہ گیا اور اتنے قریب پہنچ کر آپؐ کی آنکھ چکاچوند بھی نہ ہوئی اور اس کے برعکس موسیٰ علیہ السلام نے کتنے فاصلے سے اللہ کا جلوہ دیکھا تو بے ہوش ہو گئے تھے (سورۃ الاعراف ۱۴۳ میں جس کا ذکر ہے)۔ سورہ والنجم کی انھی آیتوں میں یوں بھی فرمایا ہے کہ

" یعنی آپؐ نہیں بولتے کچھ بھی اپنی مرضی سے بلکہ وحی جو آپؐ
کو پہنچی ہے"۔

گویا آپؐ کے ہر قول کو اللہ تعالیٰ نے اپنا قول قرار دیا ہے۔ پھر آپؐ کے بلند مقام کا ذکر سورہ کوثر میں بھی آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

" بے شک ہم نے عطا کیا آپ کو کوثر"۔

یہاں عطا کر دینے کا لفظ آیا ہے۔ عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ اس لیے کہ کوثر کے عطا ہونے کے بعد آپؐ کو پورا اختیار مل گیا کہ جس کو چاہیں آپؐ حوض کوثر سے پلائیں، یعنی جس کو چاہیں مغفرت کا سزاوار ٹھہرائیں۔ یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی فضیلت ہے کہ آپؐ کے ذکر کو بھی اللہ تعالیٰ نے بلند فرما دیا سورۃ الانشراح میں آتا ہے: "اور ہم نے بلند کیا آپ کے لیے آپ کا ذکر"۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام کرۂ ارض میں مسلسل اور متصل (اوقات کے فرق کی وجہ سے) اذان ہوتی رہتی ہے جس میں اللہ کے ذکر کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ اذان میں، اقامت میں، تشہد میں، منبر پر، خطبوں میں، درود و سلام میں، درس و تدریس میں، گفتار و کردار میں۔ ہر جگہ اور ہر وقت سب سے زیادہ آپؐ ہی کا ذکر ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ سورۃ الاحزاب (آیت ۲۱) میں آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا ذکر ہے۔ یعنی بہترین کردار اور بے داغ حیات صرف آپؐ ہی کی ہے، جس پر عمل کرنے کی اللہ پاک کی طرف سے تبلیغ ہے کہ

"بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں بہترین کردار ہے"۔

اور آپؐ کے بہترین اخلاق کا ذکر سورۃ القلم (آیت ۴) میں آتا ہے کہ

"اور بے شک آپؐ کو خلق عظیم پر پیدا کیا ہے"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی فرمایا ہے کہ

"میں بزرگ ترین اخلاق اور اور نیکو ترین اعمال کی تکمیل کے لیے نبی بنایا گیا ہوں"۔

اس آیتِ مبارکہ میں وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے فرماں برداروں کو بھی اپنا محبوب بنا لے گا۔ گویا شرط یہ ہے کہ محبوبؐ کی فرماں برداری کی جائے۔ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کو یہ فضیلت بزم میں بھی حاصل ہے اور

رزم میں بھی حاصل ہے۔ یعنی ان کے غلاموں کو دس (۱۰) کافروں پر بھی بھاری کہا گیا ہے۔ سورۃ الانفال (آیت ۶۵) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"اے نبیؐ، آپ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دیجیے، اگر تم میں سے بیس افراد صبر (ہمت) والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو وہ کافروں کے ہزار پر غالب آئیں گے"۔

اللہ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر موقع پر فضیلت اور ایک امتیازی شان بخشی ہے۔ آپؐ سے جب بھی اللہ کا خطاب ہوتا ہے تو دوسرے پیغمبروں کی طرح نہیں، بلکہ پیارے ناموں کے ساتھ، کہ اے کملی والے (مزمل)، اے لحاف والے، اے سید، اے طاہر وغیرہ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بعض اپنے نام حضورؐ کو دے دیے ہیں۔ یعنی اللہ رؤف ہے تو آپؐ کو بھی رؤف کہا، اللہ رحیم ہے تو اس نے آپؐ کو بھی رحیم کہا۔ اسی طرح نور، متین، عزیز، رشید وغیرہ بھی اپنے نام آپؐ کو دیے ہیں اور قرآن پاک میں شروع سے آخر تک بالواسطہ یا بلاواسطہ آپؐ کے فضائل ہر جگہ درج ہیں۔

گویا بقول جامیؒ:

ہمہ قرآن در شان محمدؐ

پھر سورۃ الاحزاب (آیت ۴۵ و ۴۶) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"اے نبیؐ بے شک ہم نے آپ کو شاہد اور مبشر اور نذیر اور اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والا سراج منیر بنا کر بھیجا ہے"۔

شاہد کے معنی امام راغب نے مفردات میں اس طرح دیے ہیں:

"شہود اور شہادت کے معنی ہیں حاضر ہونا مع ناظر ہونے کے، بصر کے ساتھ ہو یا بصیرت کے ساتھ"۔

سورہ بنی اسرائیل (آیت ۷۹) میں اسی لیے آپؐ کے "مقام محمود" کا ذکر ہے۔

آپؐ ہی تمام امتوں کی شفاعت کا وسیلہ بنیں گے اور چوں کہ آپؐ "شاہد" ہیں اس لیے تمام مخلوق کے اعمال و افعال و احوال کا مشاہدہ فرمائیں گے۔

اشاعت کے سلسلے میں سورۃ النساء (آیت ۶۴) کی آیت بھی یاد رکھنی چاہیے۔ ارشاد ہے کہ

"اور اگر جب وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کریں (یعنی معصیت میں مبتلا ہوں) تو اے محبوبؐ، وہ تمھارے پاس حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسولؐ ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو وہ بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے"۔

آیتِ مبارکہ میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ اسی وقت مقبول ہوتی ہے جب کہ آپؐ بھی شفاعت فرمائیں اور ظاہر ہے کہ آپؐ اپنے پیروکاروں کی شفاعت فرمائیں گے۔ سورہ آل عمران (آیت:۳۱) میں ارشاد ہے:

"اے محبوب! آپ فرما دیں کہ اے لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار بن جاؤ، اللہ (پھر) تم سے محبت فرمائے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

رسول کریمؐ

عنفوان شباب

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نوجوانی کے حالات کو جاننے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دائی حلیمہ کے اس بیان کو پیش نظر رکھا جائے جو آپؐ کے مشن کا خلاصہ ہے۔ دائی حلیمہ فرماتی ہیں کہ دودھ چھڑانے کے بعد آپؐ جب بامعنی بول بولنے لگے تو سب سے پہلے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

اللہ اکبر کبیرا ○ والحمد للہ کثیرا ○ سبحان اللہ بکرۃ واصیلاً ○ یہ پیغمبرانہ کلمات ایک دو ڈھائی سال کے بچے کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ ان کلمات ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کس مقصد کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ پھر عمر کے ابتدائی زمانے میں مختلف راہبوں نے آپؐ کے متعلق پیشین گوئیاں کیں اور بتایا کہ آپؐ وہی ہیں جن کے متعلق " **صحف ابراہیم و موسیٰ** " میں ذکر ہے۔

جب آپؐ ۱۲ یا ۱۴ سال کے تھے تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کو روانہ ہوئے۔ بصریٰ کے قریب ایک راہب نے پورے قافلے کی دعوت کی۔ دعوت کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو تکنے لگا۔ پھر آپؐ کی آنکھ، کان، ناک اور پشت پر غور کرنے لگا۔ دونوں مونڈھوں کے درمیان مہر نبوت تھی، اس کو بوسہ دیا۔ پندرہ برس کی عمر تک آپؐ بکریاں چراتے رہے۔ سولھویں سال آپؐ نے اپنے چچا

زبیر بن عبدالمطلب کے ساتھ یمن کی طرف تجارتی سفر کیا۔ اس سفر میں آپؐ کے ساتھیوں نے بہت کامیابی حاصل کی اور خوب منافع حاصل کیا، لیکن یہیں آپؐ نے ان کی تجارت کے نقائص کی نشان دہی فرمائی۔ احادیث میں بیع و شرا سے متعلق جو احکام آتے ہیں وہ پیغمبری سے پہلے کی خداداد صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں۔

جب آپؐ کی عمر بیس سال کی تھی تو آپؐ حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ، جو اس وقت اٹھارہ سال کے تھے، شام کی طرف دوسری بار سفر پر تشریف لے گئے۔ اسی سفر نے حضرت ابو بکرؓ کو آپؐ کا ہمیشہ کے لیے رفیق بنا دیا۔ اس سفر میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آپؐ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کسی کام کے لیے جانے لگے تو ایک راہب مل گیا۔ اس نے پوچھا کہ وہ صاحب جو درخت کے نیچے بیٹھے ہیں، ان کا کیا نام ہے؟ حضرت ابو بکر نے کہا، "محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب"۔ راہب نے کہا، بالکل ٹھیک ہے، انھی کو محمد ہونا چاہیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی حلیے والے کو "خلو محمدیم" کہا ہے۔

اسی زمانے میں جب آپؐ مکہ میں تھے۔ آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا کہ چچا جان، مجھے کئی راتوں سے ایسا نظر آتا ہے کہ دو شخص آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یہ تو وہی شخص ہے، مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا"۔ چچا آپؐ کو ایک راہب کے پاس لے گئے اس نے کہا کہ "یہ فرزند ایک عظیم انسان ہونے والا ہے اور وہ دو شخص فرشتے ہیں"۔

پھر قریب ۲۵ سال کی عمر میں آپؐ کی خدمات حضرت خدیجہ نے مستعار لیں۔ تجارت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس تجارت کی راہ میں بھی ایک راہب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بھی وہی کہا جو سب نے کہا تھا اور جو اللہ تعالیٰ نے سب سے کہلایا تھا، یعنی "وما محمد الا رسول" (محمد نہیں ہیں مگر رسول)۔

صلی اللہ علی النبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

اتباع رسولؐ

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک جگہ کلمہ، طیبہ کی تشریح میں ایسی عمدہ بات فرمائی ہے کہ "لا الہ الا اللہ" کے معنی ہیں کہ سوائے اللہ کے کسی کے آگے نہ جھکا جائے اور محمد رسول اللہ کے معنی ہیں کہ سوائے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے، کسی کی پیروی نہ کی جائے۔ گویا کلمہ، طیبہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارا سر کبھی غیر اللہ کے آگے نہ جھکے اور ہر معاملے صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے۔ اگر ایسا ہے تو بے شک ہم نے کلمہ، طیبہ پڑھا ہے، ورنہ نہیں۔

سورۃ النساء (۸۰) میں ارشاد باری ہے کہ

"جس شخص نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تو بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپؐ کو ان کا نگراں بنا کر نہیں بھیجا"۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہے کہ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے جو کچھ آپؐ فرماتے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ سورۃ النجم (آیت ۳۔۴) میں ارشاد ہے کہ

"اور آپؐ اپنی خواہش والی بات نہیں کہتے (بلکہ) وہ محض وحی ہوتی ہے"۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صرف اللہ تعالیٰ کی بات نکلتی ہے، تو جب ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہے تو پھر

کسی اور کی بات کیوں سنی جائے اور اس پر عمل کیوں کیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ اطاعتِ رسولؐ اس لیے بھی اطاعتِ الہیٰ ہے کہ جن احکام الہیٰ کے ہم مکلف ہیں وہ ہمیں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہیں اور یہ احکام دو طرح حاصل ہوئے ہیں۔ ایک تو قرآن پاک سے بلاواسطہ حاصل ہیں، دوسرے بالواسطہ ہیں۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ملے ہیں۔ ان دونوں قسموں کا نام شریعت ہے اور ان دونوں قسموں کے احکام یعنی شریعت پر عمل کرنا فرض ہے۔ اگر اس فرض کی اتباع اور پیروی نہیں کی تو ہمارا مسلمان ہونا بیکار ہے۔ اگر کوئی شخص، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کرتا اور حدیث کا انکار کرتا ہے تو وہ خود اللہ تعالیٰ کے احکام کا منکر ہے۔ اس لیے دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

ایک موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے لوگو، آگاہ رہو کہ بے شک مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی کی مانند اور علم بھی دیا گیا ہے۔ (یعنی حدیث) خبردار رہو کہ ایک پیٹ بھرا شخص اپنے چھپر کھٹ پر سے کہے گا کہ تم پر قرآن اختیار کرنا تو لازم ہے، یعنی وہ صرف قران کو اختیار کرنے کے لیے کہے گا اور کہے گا کہ تم اس میں جس چیز کو حلال پاؤ تو صرف اس کو حلال جانو اور جس چیز کو حرام پاؤ صرف اس کو حرام جانو۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ بلاشبہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے حرام کیا ہے وہ اس کی مانند ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ بعد کے پیٹ بھرے لوگ ایسے بھی ہوں گے اور واقعی ہوئے ہیں کہ جنھوں نے صرف قرآن کو پڑھا اور اپنی سمجھ کے مطابق جو چاہا سمجھا اور اس طرح سمجھ کر بہک گئے۔ سورہ آل عمران (آیت ۳۲) میں اسی لیے ارشاد ہے کہ

> "آپؐ فرما دیں کہ تم اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں رکھتا"۔

اس آیتِ مبارکہ سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ساتھ ہی اس کے رسولؐ کی

اطاعت فرض ہے اور اگر کوئی شخص اس اطاعت سے روگردانی کرے گا تو وہ کافر ہے اور سورہ آل عمران (آیت ۳۱) میں تو اور بھی واضح ارشاد ہے کہ

"آپؐ فرمادیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ (پھر) اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا مہربان ہے"۔

اس آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ کی کس قدر محبت اور مہربانی کا اظہار ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور اتباع اختیار کرے گا وہ بھی اللہ کا محبوب بن جائے گا۔ پھر اس کے سب گناہ بھی معاف ہو جائیں گے اور وہ ہر طرح بخشش کا مستحق بن جائے گا یعنی اس کے برعکس جو شخص یہ اتباع نہیں کرے گا وہ اللہ کے نزدیک مردود ہو گا۔

اتباع کے سلسلے میں ایک بزرگ نے بڑی عمدہ بات کہی کہ اتباع کا سبق تو ایک عورت سے سیکھو کہ وہ ایک ہی بول بولتی ہے اور عمر بھر کے لیے اپنے شوہر کی فرماں بردار بن جاتی ہے۔ لیکن تم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کلمہ طیبہ پڑھتے ہو، اتنا بڑا کلمہ، پھر بھی تم نہ اللہ تعالیٰ کے فرمان پر چلتے ہو اور نہ رسولؐ کی اتباع کرتے ہو۔ واقعی افسوس اور شرم کی بات ہے۔

سورۃ الاحزاب (آیت ۲۱) میں ارشادِ الہیٰ ہے کہ "بے شک تمھارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے"۔ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین نمونہ فرمادیا تو پھر ہم کو کسی اور نمونے کی کیوں تلاش ہے؟ یہ تلاش اسی لیے ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین نمونہ نہیں سمجھا اور ایمان ہی حاصل نہیں کیا اور ایسے لوگوں کی پیروی کی جو ہر لحاظ سے ناقص ہیں۔

ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو گا جب تک کہ اس کی ہر خواہش اس شریعت کے

تابع نہ ہو جائے، جسے میں لے کر آیا ہوں"۔

چناں چہ ظاہر ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی ایمان ہے اور اس پیروی کے بغیر ایمان نصیب نہیں ہو سکتا ہے۔

سورۃ الحشر (آیت ۷) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ

"رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جو احکام دیں ان کو اختیار کرو اور جس چیز سے تمھیں روک دیں اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو"۔

اس آیت مبارکہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرمان کی اطاعت فرض ہے اور مسلمان کو اختیار ہی یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں شریعت کو اختیار کرے اور کیوں اختیار نہ کرے جب کہ اس شریعت میں وہ سب احکام ہیں جو دنیا میں کبھی نہیں تھے۔ ایمانیات، اعتقادات، عبادات، معاملات، نظامات، اخلاقیات وغیرہ میں سے کون سی چیز ہے، جو شریعت میں موجود نہیں اور کون سی ایسی بات ہے جس کے لیے ہدایت اور رہبری نہ ملتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہر امر کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور یہی ان کی کاملیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور سلف صالحین نے ہمیشہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم اور ہر فیصلے کو کامل، مکمل اور ہر لحاظ سے اٹل سمجھا۔

حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ بشر نامی ایک منافق سے ایک یہودی کے ساتھ کسی معاملے میں جھگڑا ہو گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملے کی تحقیق فرمائی اور یہودی کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ وہ منافق اس بات پر راضی نہ ہوا اور اس نے اس یہودی کو تیار کر لیا کہ اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے وہ معاملہ پیش کیا جائے۔ منافق کو یہ گمان تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کافروں کے سخت مخالف ہیں اس لیے اس یہودی کے خلاف فیصلہ دے دیں گے۔ بہر حال وہ دونوں

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے یہودی نے پورا واقعہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فیصلہ فرمایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکان میں تشریف لے گئے اور تلوار لا کر اس منافق کا کام تمام کر دیا اور فرمایا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہ ہو اس کے لیے یہی فیصلہ ہے۔ اب ہم ذرا اپنے معاملات کا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ کن کن معاملات میں ہر روز ہم لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف عمل کرتے ہیں اور ہر روز کتنی بار قتل کیے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

آخر میں اس اتباع اور پیروی والے کے لیے اجر کا وعدہ بھی سن لیجیے۔

سورۃ النساء (آیت ۶۹ - ۷۰) میں ارشاد ہے:

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پہ اللہ نے انعام فرمایا ہے اور وہ انبیاے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے فضل ہے اور اللہ جاننے والا کافی ہے"۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

خشیتِ الٰہی

خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو یعنی جس سے ڈرا جائے، اس کی عظمت اور کبریائی کا علم ہو سچناں چہ یہ خوف محض اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوتا ہے، جس کی بزرگی کے اعتراف کے لیے خوف کیا جاتا ہے اور انسان دین و دنیا دونوں کی فلاح کے لیے اس کے کرم کا محتاج ہوتا ہے۔ سورہ فاطر (آیت ۲۸) میں اسی لیے ارشاد ہے کہ

"اللہ تعالیٰ سے اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں"

یعنی وہ بندے ڈرتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا علم ہوتا ہے۔ دراصل یہی عقیدہ ہر برائی سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے علم کے ساتھ اس کا خوف اپنے دل میں پیدا کریں تو ہم سے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن عملی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں نہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا احساس ہے اور نہ اس کا کوئی خوف ہے، اسی لیے دنیا میں بھی رسوائی ہوتی ہے اور آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ بعد کی بات ہے۔ اسی خوف اور پھر اس کے اجر کے متعلق سورۃ الملک کی آیات ۱۲ تا ۱۴ میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"جو لوگ اپنے پروردگار سے اسے بے دیکھے ہوئے ڈرتے ہیں
ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم مقرر ہے اور تم لوگ خواہ چھپا کر
بات کہو خواہ پکار کر کہو، اس کو سب خبر ہے۔ کیوں کہ وہ تو دلوں تک
کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ کیا وہ نہ جانے گا جس نے سب کو

پیدا کیا ہے؟ اور وہ تو لطیف و خبیر ہے"۔

انسان ضعیف البنیان کے اندر دھرا ہی کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عظیم شان والی ذات سے پوشیدہ رہ سکے۔ ایسا اعتراف تو بے شک ہم کو ہے، لیکن دنیا کی محبت کے غلبے کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے اور نہ اسے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں سورۃ البینہ میں (آیت ۷-۸) میں ارشاد ہے کہ

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے صالح عمل کیے وہی تمام مخلوق میں بہتر ہیں۔ ان کا صلہ ان کے رب کے پاس رہنے کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔ یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرے"۔

گویا اللہ تعالیٰ سے ڈرنا یہی ہے کہ اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور اطاعت و بندگی ہی کو اپنا شیوہ بنایا جائے۔

سورۃ النازعات (آیت ۴۰-۴۱) میں بھی اللہ تعالیٰ کی اسی اطاعت کے اجر کا ذکر ہے کہ

"اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے ڈرا اور اس نے اپنے آپ کو نفسانی خواہشوں سے روکا، تو بے شک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے"۔

یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خود کو اپنی نفسانی خواہشوں سے روکے، گویا ایسا کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے خوف سے ممکن ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ پھر نفسانی خواہشوں سے بچنے کے جو درجات، شریعتِ مطہرہ میں ہیں وہ تین ہیں؛ سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان ان باطل عقیدوں سے بچے جو نصوص یعنی قرآن و حدیث اور اجماع کے خلاف ہوں۔ اس درجے کے حاصل کرنے والا شخص

مسلمان کہلانے کا مستحق ہے۔دوسرا درجہ یہ ہے کہ جب انسان کسی معصیت کا ارادہ کرے تو اسے فوراً یہ خیال آجائے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور حساب دینا ہے، یہ درجہ تقویٰ کا ہے۔اور تیسرا درجہ جو سب سے اعلیٰ ہے وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی یاد کو اس قدر خود پر غالب کرلے کہ اس کا نفس اسے برائی کی طرف نہ لے جاسکے۔یہ درجہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا ہوا کرتا ہے، جو مزکی ہوتے ہیں اور دوسروں کا بھی تزکیہ نفس کیا کرتے ہیں اور انھیں دوسروں کے مزکی اور مطہر نہ ہونے پر ملال ہوتا ہے۔حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وصف کا ذکر سورہ طٰہٰ (آیت ۲۔۳) میں اس طرح آتا ہے کہ

"اے محبوب، ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتار کہ تم مشقت میں پڑو۔ہاں اس کے لیے نصیحت ہے جو ڈر رکھتا ہو"۔

بعض مفسرین اس آیت مبارکہ کی شان نزول کے متعلق لکھتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے ایمان سے محروم رہنے پر بڑا صدمہ ہوتا تھا اور آپ اکثر ملول و مغموم رہا کرتے تھے، تو یہ آیت مبارکہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور ارشاد ہوا کہ "آپؐ کا کام صرف دین کو پہنچانا ہے، گویا آپ پریشان نہ ہوں، اللہ تعالیٰ خود ہی لوگوں کو جس طرح اور جس قدر چاہے گا ہدایت دے گا"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس انداز سے تبلیغ فرمائی اور آپؐ سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام نے جس طرح لوگوں کی اصلاح فرمائی تھی۔اس کا ذکر سورۃ الاحزاب (آیت ۳۹) میں اس طرح آتا ہے کہ

"وہ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں کرتے اور اللہ بس ہے حساب لینے والا"۔

یعنی انبیاء علیہم السلام کی شان تبلیغ ہی یہ تھی کہ وہ اللہ کا پیام پہنچانے میں

کسی سے خوف نہ کرتے تھے۔ البتہ ان کو صدمہ ضرور اس بات کا ہوتا تھا کہ لوگوں نے ان کی بات نہیں سنی۔ اور واقعی تعجب اور افسوس بھی ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف اور خشیت نہ ہو اور غیر انسان میں موجود ہو۔ اللہ تعالیٰ کی شان کبریائی کے اعتراف میں انسان تو کیا، پتھر بھی لرز جاتے تھے۔ سورۃ البقرہ (آیت ۷۴) میں ذکر ہے کہ

"اور پتھروں میں کچھ تو وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں، جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں، جو اللہ کے خوف (اور خشیت) سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمھارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں"۔

سورۃ الحشر (آیت ۲۱) میں بھی اسی طرح ارشاد ہے کہ

"اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور تو اسے دیکھتا جھکا ہوا، پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے۔ اور یہ مثالیں لوگوں کے لیے ہم بیان کرتے ہیں کہ وہ سوچیں"۔

اللہ تعالیٰ نے جمادات تک کی مثالیں پیش فرمائی ہیں تاکہ انسان غور تو کرے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اگر ہماری فکر اور سوچ صحیح راہ پر ہو تو خشیت پیدا ہونا کوئی مشکل نہیں۔ واقعی کس قدر محرومی اور بدنصیبی کی بات ہے کہ ہم اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرتے ہیں لیکن اپنے عمل سے اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے حالاں کہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ ہر سانس میں ہم اس کو یاد کریں اور سمجھیں کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اگر حقیقت میں یہ جذبہ ہمارے دلوں میں کارفرما ہو تو یقیناً ہم سے گناہ بھی سرزد نہ ہوں گے اور خشیتِ الٰہی کی نعمت سے بھی ہم سرفراز ہوں گے۔

اللہ پر بھروسا

اللہ پر بھروسا یعنی **توکل علی اللہ** کے معنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ اس طرح بتاتے ہیں کہ

"توکل یہ ہے کہ بندہ پر یقین اتنا غالب ہو کہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت میں اسباب کے متعلق اس کو کوششیں سرد پڑ جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کسب کے جو طریقے مقرر فرما دیے ہیں، بغیر اس کے کہ ان پر اعتماد ہو، ان طریقوں پر گامزن رہے"۔

اس وضاحت سے اجمالی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے، اسباب پر اعتماد نہ ہونا چاہیے بلکہ ہمیشہ مسبب الاسباب پر اعتماد ہونا چاہیے۔ باقی رہا یہ معاملہ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھنا چاہیے تو اس کے لیے یہی بات صحیح ہے کہ اسباب ضرور تلاش کرنا چاہیے، لیکن ان اسباب پر اعتماد نہیں چاہیے۔ کیوں کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سی چیز ہمارے لیے مفید ہے یا مضر ہے اور کون سے اسباب صحیح ہیں یا صحیح نہیں ہیں۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے ان اسباب کے متعلق فرمایا ہے کہ

"دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے۔ بعض اسباب ظاہر ہیں، بعض چھپے ہوئے ہیں۔ اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ ہے۔ جب اللہ چاہے اس کی تاثیر، اندازے سے کم زیادہ کر دے، جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرجاتا ہے اور گولی سے کبھی بچ بھی جاتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے، وہ ہرگز نہیں بدلتا۔

اندازے کو تقدیر کہتے ہیں ۔ یہ دو تقدیریں ہوئیں ۔ ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی "۔

شاہ صاحبؒ کی یہی بات فتاویٰ بزازیہ میں اس طرح آئی ہے:

" توکل کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وہ کہ جس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقین کی صفت فرمایا ہے، یعنی " یہ وہ لوگ ہیں جو نہ منتر کرتے ہیں نہ منتر کراتے ہیں، نہ داغتے ہیں نہ داغ لگواتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں "۔ یعنی جو کچھ قضائے الٰہی ہو چکی اس پر دل کے مطمئن ہو جانے کا نام توکل ہوا ۔ خواہ نفع ہو، خواہ نقصان ہو، کچھ ملے یا نہ ملے اور کوئی اضطراب بھی نہ ہو ۔ دل کا اس طرح مطمئن ہو جانا سابقین کی شان ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسباب پر متوجہ ہونا اور ان میں مشغول ہو جانا اور مسبب الاسباب پر نظر نہ رکھنا توکل کو ختم کر دیتا ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث ہے کہ

" اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرو جس طرح کہ توکل کا حق ہے تو تمھیں اسی طرح رزق ملے جس طرح کہ پرندوں کو ملتا ہے کہ صبح کو خالی پیٹ اٹھتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ جاتے ہیں "۔ یعنی پرندے حصول منفعت یا دفع مضرت کی پروا نہیں کرتے اور ملنے نہ ملنے سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں ۔

" عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ نے جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں ناقہ کو چھوڑ دوں اور توکل کروں ؟ یا باندھ دوں اور توکل کروں ؟ یہ سوال انھوں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ توکل کے ذریعے اپنے اونٹ کو گم ہو جانے سے بچانا چاہتے تھے ۔ پھر

ارشاد یہی تھا کہ اونٹ کا پیر باندھ کر توکل کیا جائے"۔

غزوہ، تبوک سے رہ جانے والے تین اشخاص میں سے ایک حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے۔ان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ " تم اپنا کچھ مال رہنے دو"۔ یہ اس وقت فرمایا تھا جب کہ انھوں نے عرض کیا تھا کہ " میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنے مال سے الگ ہو جاؤں"۔اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ " بلال خرچ کرو اور عرش والے سے کم دینے کا خوف نہ کرو"۔ بہر حال توکل وہی ہے جس کا ذکر شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے کیا ہے کہ اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب پر بھروسا کرنا چاہیے، کیوں کہ صرف وہی جانتا ہے کہ ہمارے لیے کون سی چیز کس طرح پہنچتی ہے اور کیوں کر پہنچتی ہے۔ کسی چیز کے ملنے نہ ملنے کی پروا نہ کرنا، نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ کو سمجھتے ہوئے اپنے نفع و نقصان سے بے نیاز ہونا بے شک اعلیٰ قسم کا توکل ہے۔ البتہ اپنے نقصان سے بچنے کے لیے حفاظتی اقدام کرنا بھی ایک قسم کا توکل ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات میں ان دو قسموں کا ذکر آتا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آخری آیت میں منافقین اور کفار کے اعراض کا ذکر ہے کہ

" پھر اگر وہ لوگ (آپ سے) منہ پھیر لیں تو آپ فرما دیں کہ مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے"۔

اس آیت کریمہ میں اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ لوگ اگر آپ کی بات نہیں مانتے اور ایمان نہیں لاتے تو آپ مطلق فکر مند نہ ہوں اللہ آپ کے لیے کافی ہے جو دین کو بھی عام کرے گا اور آپ کی بھی حفاظت فرمائے گا۔ اس قسم کے توکل کا بہت ذکر ہے۔ مثلاً نوح علیہ السلام کی تبلیغ کے سلسلے میں سورہ، یونس (آیت ۷۱) میں ارشاد ہے:

"اور انھیں نوح علیہ السلام کی خبر پڑھ کر سناؤ، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم، اگر تم پر شاق گزرا ہے میرا کھڑا ہونا اور اللہ کی نشانیاں یاد دلانا، تو میں نے اللہ ہی پر بھروسا کیا۔ (پس اب) تم مل کر کام کر لو اور اپنے جھوٹے معبودوں سمیت اپنا کام پکا کر لو، (پھر) تمھارے کام میرا تم پر کچھ گنجلک نہ رہے، پھر جو ہوسکے میرا کر لو اور مجھے مہلت نہ دو"۔

اس آیتِ مبارکہ میں نوح علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے کہ وہ آپ کے درپے آزاد ہوئی اور ہر موقع پر آپ کی تکذیب کی۔ لیکن نوح علیہ السلام ان سے مطلق خائف نہیں ہوئے اور فرمایا کہ تم اور تمھارے سبھی معبود اور تمھارے سبھی حامی و مددگار مل کر بھی مجھے نقصان پہنچانا چاہیں تو مجھے پروا نہیں۔ میرے لیے اللہ کافی ہے اور میں نے اپنا معاملہ اللہ ہی کے سپرد کر دیا ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں بھی اسی طرح ارشاد آتا ہے کہ

"پھر اگر تم لوگ منہ پھیر لو، تو میں تم سے کچھ اجرت تو نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ ہی دے گا اور مجھے حکم ہے کہ مسلمانوں میں سے رہوں"۔

قوم نوح و عاد و ثمود کا ذکر سورہ ابراہیم میں بھی آتا ہے۔ آیات (۱۱-۱۲) میں ارشاد ہے کہ

"ان کے رسولوں نے ان سے کہا، ہم ہیں تمھاری طرح انسان، مگر اللہ اپنے بندوں میں جس پر چاہے احسان فرماتا ہے اور ہمارا کام نہیں کہ ہم تمھارے پاس کچھ سند لے آئیں، مگر اللہ کے حکم سے۔ اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر بھروسا چاہیے۔ اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں۔ اس نے تو ہماری راہیں ہمیں دکھلائیں۔ اور

تم جو ہمیں ستا رہے ہو، ہم ضرور اس پر صبر کریں گے اور توکل کرنے
والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے"۔

اللہ پاک پر پورا پورا اعتماد کرنا اور اپنے کاموں کو اس کے سپرد کر دینا بہت بڑا توکل ہے اور مشورہ کر لینا اس توکل کے منافی نہیں ہے۔ سورہ آل عمران (آیت ۱۵۹) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم اور میٹھی طبیعت کا ذکر آتا ہے کہ

"(اے محبوبؐ) اللہ کی کیسی مہربانی ہے کہ آپ ان لوگوں کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج، سخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ کے گرد سے پریشان ہو جاتے تو آپ انھیں معاف فرما دیں اور ان کی شفاعت فرما دیں اور ان سے کاموں میں مشورہ لیں اور جب کسی بات کا پکا ارادہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں۔ بے شک توکل کرنے والے لوگ اللہ کو پیارے ہیں"۔

اس آیت مبارکہ میں توکل سے پہلے مشورہ کر لینے کا بھی حکم ہے کہ جب صالح حضرات کا مشورہ حاصل کر لیا اور اس مشورے کے بعد کسی کام کا پکا ارادہ کر لیا تو پھر اللہ پر توکل کافی ہے۔ یعنی اللہ پاک کو ایسے لوگ بہت پیارے ہیں۔ کامیابی کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔

سورۃ الانفال (آیت ۶۱) میں بھی ایسے متوکل لوگوں کو تسلی دی گئی ہے کہ

"اگر وہ (کفار) صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو اور اللہ پر توکل کرو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

یعنی اگر کفار تم سے صلح کرنے پر آمادہ ہیں تو پھر تم بھی صلح کر لو اور اللہ ضرور تمھارا حامی و مددگار ہوگا۔ بہر حال ان تمام آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ توکل کے معاملے میں اسباب پر توکل نہیں چاہیے بلکہ مسبب الاسباب پر پورا پورا توکل چاہیے، پھر کامیابی یقینی ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

جواب دہی کا تصور

ہر مہذب معاشرے کا قانون "جواب دہی کا تصور" سکھاتا ہے۔ جب تک یہ تصور نہ ہو کسی معاشرے میں امن و امان کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام سراپا امن و امان ہے اور وہ جواب دہی کے تصور ہی کو اہم قرار دیتا ہے تاکہ دنیا میں امن و امان قائم ہو، فتنہ و فساد ختم ہو، بنی نوع انسان سلامتی اور صلح و آشتی کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکے اور وہ نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہو کر دنیا کی خدمت کر سکے۔ اسلام کے اوامر اور نواہی ہی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان سب کا مقصد امن و امان ہے اور مواخذے کا تصور ہے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے یہاں پیش ہونا ہے، جب کہ بقول سورۃ الزلزال (آیت ۷-۸):

> "تو جو ایک ذرہ بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا"۔

سورۃ البقرہ کے شروع ہی میں (آیت ۲-۴ میں) ارشاد ہے:

> "(یہ) وہ بلند مرتبہ کتاب (ہے) کوئی شک کی جگہ نہیں، اس میں ہدایت ہے متقین کے لیے جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم رکھیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو آپؐ سے پہلے نازل ہوا اور آخرت پر یقین رکھیں"۔

ایمان لانا، نماز قائم رکھنا، مخلوق پر خرچ کرنا، کتابوں پر ایمان لانا اور آخرت پر

یقین رکھنا سب اسی لیے ہے کہ ہم نظام امن کو نہ صرف تسلیم کریں بلکہ اسے قائم بھی کریں اور آخرت پر یقین رکھیں، جہاں چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی حساب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اللہ تعالیٰ کا خوف بھی اسی لیے ہے کہ غیر اللہ کے خوف سے بے نیاز ہو کر اللہ کے احکام پر عمل کیا جائے اور اس دن کو یاد کیا جائے جب کہ جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ سورہ لقمان (آیت ۳۳) میں ارشاد ہے کہ:

"اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو جس میں کوئی باپ اپنے بچے کے کام نہ آئے گا اور نہ کوئی کام والا بچہ اپنے باپ کو کچھ نفع دے گا"۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور حقوق اللہ ادا کرنا ان تمام احکام کی تعمیل ہے جس کا اس نے امر فرمایا ہے۔ زندگی کے سب کام، تمام کاروبار، اخلاق اور عادات سب اسی کی مرضی کے مطابق رکھنا بھی حقوق اللہ کا ادا کرنا ہے۔ جو چیز اس نے حلال کی ہے اسے حلال سمجھنا اور جس کو اس نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام جاننا اور صرف اس کی پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھنا بھی عبادت ہے۔ لیکن حقوق العباد کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان حقوق کے ادا کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی کو پیش نظر رکھنا بھی حقوق اللہ کا ادا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ سورہ بنی اسرائیل (آیت ۲۳۔۲۴) میں ارشاد ہے:

"اور تمھارے رب نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر تمھارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اف بھی نہ کہنا اور نہ انھیں جھڑکنا۔ اور تم ان سے ادب سے بات کرو اور ان کے سامنے انکساری سے بازو بچھاؤ۔ نرم دلی سے اور عرض کرو کہ اے رب تو ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ بچپن میں انھوں نے میری پرورش کی

ہے"۔

ورنہ والدین کے ساتھ ایسے سلوک نہ کرنے والا عذابِ الٰہی میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری کرتا ہے، اس کو آخرت سے پہلے، دنیا ہی میں طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کر دیتا ہے"۔

والدین کے ساتھ بھلائی یا ان کے ساتھ برائی، دونوں باتوں کا تصور اسی لیے ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں اور مواخذے کے دن کے لیے تیار ہو جائیں۔

والدین کے حقوق کے علاوہ اولاد کے حقوق، بیوی کے حقوق، عزیزوں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، پھر اولادِ آدم کے حقوق بلکہ جانوروں اور درختوں تک کے حقوق پر اسلام نے زور دیا ہے۔ قرآن پاک کی آیتوں اور احادیث میں ان کے لیے احکام ہیں اور یہ صرف اسی لیے ہیں کہ ہمارے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور اس خوف سے حقوق کے ادا کرنے کا خیال پیدا ہو۔ ورنہ پھر مواخذے کے دن کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اوامر میں عبادت و اطاعت کے علاوہ جہاد بھی ہے، جہاد کی تیاری بھی ہے، تاکہ کافر ہراساں اور مغلوب رہے۔ حلال چیزیں بھی ہیں، اللہ کی راہ میں اپنی پیاری چیزوں کا خرچ کرنا بھی ہے، امانتیں ان کے مالکوں کو ادا کرنا بھی ہے، فساد سے بچنے کے لیے قصاص بھی ہے تاکہ انسانی جان کا احترام رہے اور قاتل کو بالکل کھلا نہ چھوڑ دیا جائے۔ ایسے اوامر تمام کے تمام انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے ہیں اور ان کو ملحوظ رکھنا بھی "جواب دہی کے تصور" کے ذیل میں ضروری ہے۔

نواہی کے ذیل میں سب سے مقدم یہ ہے کہ شرک نہ کرو۔ سورہ لقمان (آیت ۱۳) میں ارشاد ہے:

"اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا۔ بے شک شرک بڑا ظلم ہے"۔

شرک ایسی برائی اور ایسا ظلم ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی گستاخی ہے اور خود انسان کی شان میں بھی گستاخی ہے کہ وہ اللہ کا نائب ہو کر اپنے سے گھٹیا چیزوں کے آگے سر جھکائے۔

نواہی میں یہ بھی شامل ہے کہ پاک چیزوں کو حرام نہ جانو۔ سورۃ المائدہ (آیت ۸۷) میں ارشاد ہے:

"اے ایمان والو، حرام نہ ٹھہراؤ وہ ستھری چیزیں جو کہ اللہ نے تمھارے لیے حلال کیں اور حد سے نہ بڑھو"۔

حلال کو حرام جاننا اور حرام کو حلال جاننا بھی جواب دہی کے تصور کو فراموش کرنا ہے۔ اسی لیے اس کی طرف توجہ دلائی گئی۔

نواہی میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو معاشرے میں عام ہیں، چاہے وہ کسی ملک کا معاشرہ ہو اور ان سے معاشرے کی تباہی لازمی ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت ۹۰) میں ارشاد ہے:

"اے ایمان والو، شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاک ہی ہیں، شیطانی کام، پس ان سے بچتے رہنا کہ تم فلاح پاؤ"۔

شراب میں وہ تمام منشیات شامل ہیں جن سے آج بھی پوری دنیا تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ جوا ان تمام فضول مشاغل کو شامل ہے جو حرام کی کمائی کی طرف راغب کرتا ہے اور اشرف المخلوقات کی عملی قوتوں کو بے کار کر دیتا ہے۔ بت وہی ہیں جن کے آگے ہم ضرورت کے وقت یا بلا ضرورت بھی جھک جاتے ہیں اور خوشامد اور رشوت کو اس کے لیے آلہ۔ کار بناتے ہیں اور پانسے میں وہ تمام غلط طریقے شامل ہیں جن کے استعمال کرنے کے لیے انسان کو اس کا نفس مجبور کرتا ہے۔ پھر غلط طریقوں سے نفع خوری، ناقص مال دینا، شہادت کو چھپانا "**لھو الحدیث**" (بری باتوں کا کھیل تماشہ) وغیرہ سب کے لیے ایسے رذائل اور ایسی برائیاں ہیں جو "**عذاب مھین**"

تک پہنچا دیتی ہیں۔عذاب سے ڈرانا، برائیوں کی برائیاں بتانا اور اچھائیوں کی اچھائیاں ظاہر کرنا بھی تو اسی تصور اور تیقن پیدا کرنے کے لیے ہے کہ ہم غور و فکر سے کام لیں، تباہی کے گڑھے میں نہ گر جائیں، نفس کو سرکشی سے بچائیں اور آخرت کے عذاب سے ڈرتے رہیں۔اگر اسی طرح محاسبہ کیا جائے گا تو ضرور "جواب دہی" اور مواخذے سے بریت ہو سکے گی، ورنہ نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ اس کا جینا اور اس کا مرنا بھی اللہ کے لیے ہے، جیسا کہ سورۃ الانعام (آیت ۱۶۲) میں ارشاد ہے، تو اس سے وہ کام سرزد ہی نہ ہوں گے جن کے لیے "جواب دہی" کی ضرورت ہو۔

ولا تکسب کل نفس الا علیها ولا تزر وازرۃ وزر اخری o

(اور کوئی جان جو کچھ کمائے وہ اسی کے ذمے ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اللہ کے لیے جینا اور اللہ کے لیے مرنا

دنیا کا ہر سمجھدار انسان خود کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے اور وہ ذرا سی دیر کے لیے یہ کہنے کو تیار نہیں کہ وہ نباتات، جمادات اور حیوانات میں سے کسی سے کم تر ہے تو جب یہ حقیقت بھی ہے تو پھر وہ کیوں غیر اللہ کے آگے جھکتا ہے اور خود کی توہین کراتا ہے ؟ انسان کے اس بلند منصب اور مقام کو برقرار رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تاکہ انسان اپنے سے کم تر مخلوق کے آگے سر نہ جھکائے اور ان انبیاء علیہم السلام کی رہبری میں صرف اپنے سے بہتر اور برتر ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھے جو اس کا خالق ہے، اس کا رب ہے اور اس کی حیات و ممات کا مالک ہے۔ سورہ روم میں انسان کی تخلیق اس کی زندگی، اس کی معاش، اس کی معاشرت اور اس کے اعمال و افعال کا ذکر اس طرح آتا ہے:

"اور اس (اللہ) کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھاری جنس سے تمھارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور محبت کو پیدا کیا اور اس (بات) میں ان لوگوں کے لیے، جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے۔ اور تمھاری بولیوں اور رنگوں میں تنوع ہے۔ اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً دلیلیں ہیں۔ اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے یہ تمھارا رات

دن میں سونا (بھی) ہے اور تمھارا اس کی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے۔
اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کے عجائبات
قدرت میں سے یہ (بھی) ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس
سے تم ڈر جاتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید باندھتے ہو
اور وہ آسمانوں سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کی موت
کے بعد، زندہ کرتا ہے۔ اس میں ان کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں، دلیلیں
ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ آسمان اور زمین اس
کے حکم سے قائم ہیں"۔

ان آیات میں انسان کو بتایا ہے کہ تم کچھ نہیں تھے تو ہو گئے، پھر چلنے پھرنے اور زندگی کے طریقے تم کو بتائے گئے، تم کو سکون کا سامان مہیا کیا گیا اور آپس میں مؤدت اور محبت کا جذبہ دیا گیا، تمھاری بولیاں اور تمھارے رنگ بھی الگ الگ کر دیے گئے، حالاں کہ تم ایک ہی ماں باپ کی اولاد تھے، تمھارے لیے سونا جاگنا بھی مقدر کیا گیا تاکہ تم زندہ رہنے کا ڈھب سیکھو، پھر بجلی کی چمک سے خوف بھی ہے اور بارش بھی ہے کہ مردہ زمین جب بارش سے زندہ ہو سکتی ہے تو مردہ انسان بھی اس کی رحمت سے زندہ ہو سکتا ہے اور یہ آسمان اور یہ زمین کیوں کر اور کس کے حکم سے قائم و دائم ہیں؟ یہ چند باتیں انسان کی صحیح فکر کے لیے راہیں ہموار کرتی ہیں اور ان خطوط پر چلانا چاہتی ہیں جن سے منزل کا پتا چل سکتا ہے اور خالق و مخلوق کے رشتے استوار ہو سکتے ہیں
سورہ، لقمان میں بھی ارشاد ہے کہ

"اس نے آسمانوں کی چھت کو بغیر ایسے ستون کے کھڑا کیا کہ
تم دیکھو اور زمین میں لنگر ڈالے کہ تمھیں لے کر نہ کانپے اور اس میں
ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا، تو زمین میں
اچھے جوڑے پیدا کیے"۔

اس مقام پر بھی انسانی فکر کے لیے دعوت ہے کہ بغیر ستونوں والا آسمان اور لنگر والی زمین کس نے تخلیق کی اور کیوں تخلیق کی؟ یہ سب اسی لیے ہے کہ ہر قسم کے چلنے پھرنے والے یہاں رہیں، بارش سے کھیتی کی منفعت حاصل کریں اور اپنے جوڑے سے نسل قائم رکھیں تاکہ سکون بھی ہو اور دنیوی زندگی بھی قائم رہے۔ کیا ایسی قدرت والا کوئی اور ہو سکتا ہے؟ یا یہ سب چیزیں آپ ہی آپ شروع ہی سے پیدا ہو گئی تھیں؟ اور اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ تحریک و حرکت والا نظام ان سب چیزوں کو ایک زمانے کے قلب و انقلاب سے پیدا کر لیتا ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ موجودہ آسمان و زمین کے علاوہ کوئی دوسرا آسمان اور کوئی دوسری زمین پھر کیوں پیدا نہ ہو سکی؟ سورہ ملک میں اللہ تعالیٰ کی بے مثال خالقیت کے متعلق ارشاد ہے کہ

"کیا تجھے مہربانی والے خدا کی خالقیت میں کوئی ناہمواری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر لے کہ کیا (اس کی صنعت میں) کوئی فطور دکھائی دیتا ہے؟ پھر دہرا کر دوبارہ دیکھ (یعنی بار بار دیکھ)۔ تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی)"۔

ان آیات سے یہ حقیقت ظاہر ہے کہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اس کا خالق ایسا صناع ہے جس کی صنعت میں کہیں کوئی ناہمواری نہیں۔

بندے پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور انعامات اس قدر ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے:

"آسمان و زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لیے سودمند چیزیں لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسانے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں

مسخر ہیں، دانشمندوں کے لیے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں "۔

اب ہم ایسی قدرت والے ایسی رحمت والے اللہ تعالیٰ کا دلی شکر کیوں ادا نہ کریں؟ کیوں نہ اس کے احکام پر عمل کریں؟ کیوں نہ ہم اپنی جان اس کے لیے قربان کریں؟ کیوں نہ ہم اس کے لیے جییں؟ اور کیوں نہ ہم اس کے لیے مریں؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہماری زندگی اور موت کے لیے جو سبق عطا فرمایا ہے اس کا ذکر سورۃ الانعام (آیت ۱۶۲-۱۶۳) میں اس طرح ہے:

"آپ فرما دیں کہ بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے، جو رب ہے سارے جہانوں کا، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے یہی حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں"۔

اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا اور غیر اللہ کے احکام سے دور رہنا بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ پھر ان احکام کی خاطر جینا اور مرنا بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کی نشانی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ ہمارا شمار شر الدواب ہی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

تحصیل علم

تحصیل علم، انسان کی تخلیق کا جزو اعظم ہے اور اسی سے انسان کو فرشتوں پر بھی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت ۳۰-۳۱) میں ارشاد ہے:

"اور جب تمھارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، وہ بولے، کیا ایسے کو (نائب) بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خون ریزیاں کرے؟ اور ہم تو تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا، مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (اشیاء کے) نام سکھائے، پھر سب (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا، سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ"۔

ان آیتوں سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے خمیر ہی میں علم ڈال دیا تھا اور اسے علم سے متعلق ایسی صلاحیتیں ودیعت فرما دی تھیں جن سے اس کو ہمیشہ کی فضیلت اور دنیا میں اس کی حاکمیت قائم ہو سکتی ہے۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ "اقرا" ہی ہے کہ "پڑھو"۔ چناں چہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا مدرسہ کوہ صفا کی بلندی پر حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں قائم فرمایا۔ وہاں دین سے متعلق آپؐ تعلیم دیا کرتے تھے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لیے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ پھر ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں تعلیم دینے کے لیے آپؐ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور

حضرت سعد بن العاصؓ کو بھیجا تھا۔ یہ اسلام کا دوسرا مدرسہ تھا۔ پھر جب آپؐ نے ہجرت فرمائی تو مسجد نبویؐ کے ایک سرے پر صفہ اسلام کا تیسرا مدرسہ قائم کیا، جس سے تمام روے زمین کو فیض پہنچا۔ پھر جو کتاب ہم کو عطا فرمائی گئی اس کا نام قرآن ہے یعنی وہ کتاب جو سب سے زیادہ پڑھی جانے والی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ نماز میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ کم از کم تین چھوٹی آیتیں ضرور پڑھی جائیں۔ اسی کے ساتھ یہ ترغیب دلائی گئی کہ جو شخص قرآن کا ایک حرف بھی پڑھے گا تو اسے دس نیکیاں حاصل ہوں گی۔ اس ترغیب کو یہ تقویت بھی دی گئی کہ اس کا نہ صرف پڑھنا بلکہ سننا بھی ثواب میں شامل ہے۔ مزید یہ کرم ہوا کہ پورے قرآن کو حفظ کرنے والے پورے عالم اسلام میں ہر زمانے میں لاکھوں کی تعداد میں ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ احسان ہے کہ قرآن سے متعلق بے شمار علوم کے دروازے کھول دیے۔ قرآن پڑھا جائے تو اس کے صحیح مخارج و صفات کو سیکھا جائے، جسے تجوید کہتے ہیں۔ قرآن کی مختلف قراءتوں کو بھی جانیں، جنھیں قرأتِ سبعہ اور قرأتِ عشرہ کہتے ہیں۔ پھر قرآن کے سمجھنے کے لیے نئے نئے علوم وجود میں آئے۔ اعراب کی غلطی سے بچنے کے لیے علم نحو کی بنیاد پڑی۔ الفاظ کے اشتقاق معلوم کرنے کے لیے علم صرف کی ضر ت در پیش آئی۔ کلام کا اسلوب معلوم کرنے کے لیے علم معانی و بیان کی ایجاد ہوئی۔ لفظی و معنوی محاسن سمجھنے کے لیے علم بدیع شروع ہوا۔ قرآنی الفاظ کے معنی معلوم کرنے کے لیے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی کیا مراد ہے، علم تفسیر قائم ہوا۔ قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل و توضیح کے لیے علم حدیث کی ضرورت ہوئی۔ احکام کی کیفیات اور درجات معلوم کرنے کے لیے علم فقہ کی ضرورت ہوئی اور طریقہ استنباط معلوم کرنے کے لیے اصول فقہ کا علم قائم ہوا۔ عقائد کی تشریح و توضیح کے لیے علم کلام ایجاد ہوا۔ قرآن میں گذشتہ اقوام کے قصص کا علم حاصل کرنے کے لیے علم تاریخ کی بنیاد پڑی۔ پھر ان تمام علوم کی دوسری شاخیں پیدا ہوئیں۔ اس طرح کئی سو نئے علوم ایجاد

ہوئے جن کا وجود اسلام سے پہلے نہیں تھا۔ لسانیایت اور صوتیات، جس کا آج کل بڑے علوم میں شمار ہوتا ہے، وہ قرآن کے علم تجوید کے صرف مسئلہ ادغام کا ایک جزو ہے اور وہ ایسا جامع علم ہے کہ موجودہ صوتیات والے ماہرین اس پر حیرت کرتے ہیں۔

پھر ان علوم سے بہت سے فنون بھی ضمناً پیدا ہوگئے، مثلاً نماز ہی کو لیجیے کہ اس کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں؛

(۱) وقت، (۲) مقام اور (۳) جہت۔

جہاں تک وقت کا تعلق ہے تو یہ معلوم ہے کہ نماز کے اوقات مقرر ہیں۔ بعض اوقات ایسے بھی ہیں جن میں نماز ادا کرنا جائز نہیں۔ وقت کی پہچان کے لیے آفتاب کے طلوع وغروب اور زوال کے اوقات کا جاننا ضروری ہے۔ مغرب اور عشاء کا وقت اور اشراق، چاشت اور تہجد وغیرہ کے اوقات کب سے کب تک ہیں؟ فجر کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کتنا ہے۔ اگر آسمان غبار آلودہ نہیں ہے اور صاف ہے تو یہ اوقات آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں ورنہ نہیں۔ یا ہم ایسی جگہ ہیں جہاں سورج دکھائی نہیں دیتا تو ایسی صورت میں ایسے آلے کی ضرورت ہے جو اوقات کو صحیح طور پر ظاہر کرسکے، اسی لیے گھڑی بنانے کی صنعت شروع ہوئی اور ہارون الرشید کے زمانے میں گھڑی کی پہلی ایجاد ہوئی۔

نماز کے لیے جگہ کا تعین بھی ضروری ہے۔ باجماعت نماز کے لیے ایسی جگہ کا ہونا ضروری ہے جہاں لمبائی بھی ہو اور اس کے آگے منبر و محراب بھی ہو، یعنی ایک خاص قسم کی تعمیر ہو۔ چناں چہ اس تعمیر کی وجہ سے بہت سے طبقات کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ فن تعمیر کی صنعت کے لیے ایک پیش رفت ہوئی۔ اسی طرح مسجد کی تعمیر کا فن اپنی جگہ ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ نماز کے لیے تیسری ضروری چیز سمت ہے کہ رخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیے۔ چناں چہ خانہ کعبہ کی سمت جاننے کے لیے طول البلد اور عرض البلد اور محل وقوع کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہوا۔ دنیا میں کہیں بھی نماز پڑھی

جائے، اس کے لیے سمتِ کعبہ جاننا ضروری ہے۔ غرض کہ قطب نما اور دیگر آلات کی صنعت شروع ہوئی کیوں کہ ہر شخص اور ہر جگہ کے لیے سمتِ کعبہ کا جاننا آسان نہیں ہے۔

یہی حال روزے کی ضروریات کا ہے کہ اس کے لیے آفتاب کا طلوع و غروب جاننا ضروری ہے۔ پھر مہینوں کا شمار اور ایام کا ۲۹۔۳۰ ہونا بھی سمجھنا ضروری ہے۔ چناں چہ تقویم اور کیلنڈر کی ضرورت ضروری ہے اور اسی تقویم سازی کے لیے بہت سے دیگر علوم کی ضرورت پیش آتی ہے۔

حج بھی بہت سی ضروریات پر محیط ہے۔ دور دور سے لوگ حج کے لیے جاتے ہیں، سال و ماہ تو تقویم سے معلوم ہو جاتے ہیں، لیکن سمتِ کعبہ کے لیے راہیں تلاش کرنا علم جغرافیہ کو دعوت دیتا ہے۔ پھر وہاں پہنچنے کے لیے ذرائع سفر کی ضرورت ہوتی ہے۔ دور کے سفر کے لیے گھوڑے، اونٹ کیسے ہوں؟ سواریاں کیسی ہوں؟ بادبانی یا دخانی کشتی کیسی ہو؟ موسم کے تیور اور ہواؤں کے رخ کو پہچاننا بھی علم جغرافیہ میں شامل ہے۔ خشکی کے راستے، بحری راستے، فضائی راستے وغیرہ سب انھی علوم کے تحت جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ فضائی سفر کے لیے اب طیاروں کا سفر اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کس قدر علوم اور فنون صرف طیاروں کے بنانے، چلانے اور اڑانے کے لیے ضروری ہیں۔ ہر شخص جاننا بھی نہیں ہے، اسی لیے ان فنون کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔

زکوۃ بھی ایک مالی عبادت اور فریضہ ہے۔ اس کو کس حساب سے ادا کرنا ہے؟ تجارتی مال کا حساب، بارانی یا آب پاشی والی زمینوں کا حساب، سائمہ جانوروں کا حساب اور خمس عشر وغیرہ سب کے لیے حساب کا جاننا ضروری ہے۔

تقسیم میراث بھی اپنی جگہ ایک مستقل علم ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، اولاد وغیرہ کا کن حالتوں میں کتنا حق ہوتا ہے اور اس کا حساب کس طرح کیا جائے، یہ سب علم حساب کے ذیل میں آتا ہے۔ اسی کو علم الفرائض کہتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ

وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"علم الفرائض سیکھو، یہ نصف علم ہے"۔

نصف علم اس کو قرار دینا اپنی جگہ خود اس کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک اور فرض جہاد ہے، جس کے لیے سورہ انفال (آیت ٦٠) میں ارشاد ہے کہ

"تم تیار رکھا کرو ان کے لیے جتنا تم سے ہو سکے قوت اور طاقت کی چیزیں اور جنگی گھوڑے جس سے ڈرتے رہیں اللہ کے دشمن اور تمھارے دشمن اور دوسرے بھی ان کے سوا جن کو تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔ (ان کاموں کے لیے) جو کچھ تم اللہ کی خوشنودی میں خرچ کرو گے تم کو پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

غرض کہ اسلام کے تمام احکام بلاواسطہ اور بالواسطہ مختلف علوم کی تحصیل کے لیے آمادہ کرتے ہیں، جن سے دین اور دنیا دونوں کے لیے فائدے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسلام خیر ہی خیر ثابت ہوتا ہے اور **اطلبوا العلم من المهد الى اللحد** (علم حاصل کرو اپنے گہوارے سے قبر تک) اسی کے لیے حکم ہے۔

علم اشیاء

علم اشیاء سے مراد ہر وہ علم ہے جو دنیا کی چیزوں سے متعلق ہو۔ اللہ پاک نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو علم ہی کی وجہ سے مسجودِ ملائک بنایا۔ سورۃ البقرہ (آیت ۳۰-۳۲) میں ارشاد ہے:

"اور جب تمھارے رب نے فرشتوں سے فرمایا، میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ بولے، کیا ایسے کو (نائب) کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خوں ریزیاں کرے، اور ہم تو تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں۔ فرمایا، مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام (اشیاء کے) نام سکھائے، پھر تمام (اشیاء) کو ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا، تم سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ۔ وہ بولے، پاکی ہے تجھے، ہمیں کچھ علم نہیں، مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے"۔

اس کے بعد کی آیتوں میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھر حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ فرشتوں کو تمام اشیاء کے نام بتاؤ۔ انھوں نے بتا دیے، پھر ان فرشتوں کو حکم دیا کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا، سوائے شیطان کے، اور وہ کافر و مردود ہوا۔ ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام (اور ان کی اولاد) کو اشیاء کا علم عطا فرمایا، یعنی تمام اشیاء جو دنیا میں ہیں ان کو سمجھنے اور جاننے کی صلاحیت ودیعت فرمائی۔

اسی سورۃ البقرہ (آیت ۲۹) میں یہ بھی ارشاد ہے کہ "وہی (ذات) ہے جس نے تمھارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ"۔

یعنی دنیا کی ہر چیز انسان ہی کے لیے پیدا کی گئی۔ان چیزوں کو سمجھنا اور ان کی اہمیت کو جاننا ہمارا فرض ہے۔ان چیزوں کا وجود ہی انسانوں کے لیے سودمند ہے، بلکہ جن چیزوں کو ہم خطرناک اور مضر سمجھتے ہیں ان کا وجود بھی مصلحت کی بناء پر ہے۔ کیڑے، مکوڑے اور حشرات الارض ہماری بہت سی گندگیوں کو صاف کر دیتے ہیں، پھر ان کو ان سے زیادہ قوی جانور ختم کر دیتے ہیں۔اس طرح بہت سے زہریلے مادے ختم ہو جاتے ہیں اور انسان کو صحت مند فضا حاصل ہوتی ہے۔سورہ لقمان (آیت ۲۰) میں ارشاد ہے کہ

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمھارے لیے مسخر کر دیا وہ سب کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور تمھیں بھرپور اپنی نعمتیں دیں ظاہر اور چھپی ہوئی"۔

یعنی زمین میں جو کچھ ہے اور آسمانوں میں بھی جو کچھ ہے اور زمین و آسمان کے درمیان بھی جو کچھ ہے اس پر قبضہ کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ودیعت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان غور و خوض کر کے بکثرت چیزیں دریافت کرتا رہتا ہے اور اسے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ظاہر چیزیں اور چھپی ہوئی چیزیں سب انسان کے لیے ہیں جو اللہ کا نائب ہے اور اسی علم اور صلاحیت کی وجہ سے وہ فرشتوں سے بھی افضل ہے۔

سورۃ الجاثیہ (آیت ۱۲-۱۳) میں بھی ارشاد ہے کہ

"اللہ ہے جس نے تمھارے بس میں دریا کر دیا کہ اس میں اس کے حکم سے کشتیاں چلیں اور اس لیے کہ اس کا فضل تلاش کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔اور تمھارے لیے مسخر کر دیا اپنے حکم سے وہ سب کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں سوچنے والوں کے لیے"۔

واقعی اگر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس جیسی ضعیف البنیان ہستی کو اتھاہ سمندر بھی دیا اور اونچا آسمان بھی دیا، وسیع زمین بھی دی اور ان دونوں کے درمیان جو فضا ہے اس پر حکومت کرنے کی صلاحیت بھی عطا فرمائی، پھر بھی وہ ناشکرا رہے تو اس سے زیادہ بد قسمت کوئی اور مخلوق نہیں۔

اب علم اشیاء سے متعلق چند قرآنی اشارات ملاحظہ ہوں جو حیرت انگیز ہیں:

(۱) ہم ابھی سورہ لقمان اور سورۃ الجاثیہ کی آیتیں پڑھ چکے ہیں، جن میں انسانی صلاحیتوں کا ذکر ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب پر قبضہ کرنے کی صلاحیت انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ چناں چہ ہم نے دیکھ لیا کہ انسان چاند تک پہنچ گیا اور اب دوسرے سیاروں پر بھی کمند ڈالنے کی کوشش میں ہے۔

(۲) سورہ یٰسین (آیت ۳۶) میں ہے کہ "پاک ہے وہ ذات جس نے سب جوڑے بنائے ان چیزوں سے جنھیں زمین اگاتی ہے اور خود ان میں سے اور ان چیزوں میں سے جن کی انھیں خبر نہیں"۔ آج سے قریب اسی (۸۰) سال پہلے کسی سائنس داں کو علم نہیں تھا کہ حیوانات کے علاوہ نباتات اور جمادات کے بھی جوڑے ہوتے ہیں۔ اور یہ بات دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلے قرآن ہی سے معلوم ہوئی ہے۔

(۳) سورہ یونس (آیت ۹۲) میں فرعون کی لاش کا ذکر ہے کہ "پس آج ہم تیری لاش کو پانی سے تیراتے ہیں (یعنی تیری سب قوم تو قعر دریا میں ہے، ہم تیرا بدن پانی پر تیراتے ہیں)"۔ پھر فرعون اور اس کے عہد کے بعض لوگوں کی لاشوں کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ اب تک محفوظ ہیں۔ سائنس داں اس کی توجیہ میں مسالوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن یہ سب ظاہری باتیں ہیں۔ تحفظ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تاکہ ہر زمانے کے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔

(۴) موجودہ دور کے مشہور سائنس داں آئن اسٹائن (EINSTEIN) نے زمان و

مکان (TIME اور SPACE) کے مسئلے کو سمجھاتے ہوئے کہا ہے کہ تھوڑے سے فاصلے کو اگر ایک چیونٹی جیسی چیز طے کرنا چاہے تو اسے تین زمانوں سے یعنی ماضی، حال اور مستقبل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی جتنا فاصلہ وہ طے کر چکی ہے وہ اس کا ماضی ہے، جو فاصلہ وہ طے کر رہی ہے وہ اس کا حال ہے اور جو فاصلہ وہ طے کرے گی وہ اس کا مستقبل ہوگا۔ لیکن اس کے مقابلے میں اس فاصلے کو انسان بیک وقت اور بیک لمحہ طے کر سکتا ہے۔ پھر وہ دبی زبان سے اعتراف کرتا ہے کہ زمین سے آسمان تک کے فاصلے کو بھی کوئی بڑی شخصیت طے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوگی۔ گویا سورۃ النجم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جس معراج کا ذکر ہے وہ صحیح ہے۔

(۵) سورہ لقمان کی آخری آیت (۳۴) میں پانچ ایسی باتوں کا ذکر ہے جہاں سائنس داں ابھی تک نہیں پہنچ سکے۔ آیت میں ارشاد ہے:

"بے شک اللہ کے پاس ہے قیامت کا علم، اور وہ اتارتا ہے بارش، اور وہ جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹ میں کیا ہے، اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ کل کیا حاصل کرے گا، اور کوئی نفس نہیں جانتا کہ کس زمین میں فوت ہوگا"۔ بہر حال ایسی بکثرت باتیں ہیں جن کیلیے قرآن پاک میں ارشارے موجود ہیں اور علم اشیاء کے جاننے والے ان کو سمجھنے میں سرگرداں ہیں۔

علامہ اقبال نے خوب کہا ہے کہ

ولایت ، پادشاہی ، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں ؟ فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

پاکیزگیٔ خیال

خیالات کی پاکیزگی سے معاملات اور معمولات میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور معاشرے میں توازن، سکون، عافیت اور خیر و برکت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خیالات کی پاکیزگی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو اور یہ یقین ہو کہ ایک دن اس ذات "واحد القہار" کے سامنے پیش ہونا ہے، جس سے ہمارا چھوٹا بڑا کوئی عمل پوشیدہ نہیں اور ہم کو ذرے ذرے کا حساب دینا ہوگا۔ اللہ پاک کی شان کریمی تو یہ ہے کہ

> "اللہ والی ہے ایمان والوں کا، انھیں اندھیر سے نور کی طرف نکالتا ہے۔ اور جنھوں نے کفر کیا ان کے حمایتی شی یں جو انھیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، انھیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے"۔ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۵۷)

چناں چہ اللہ تعالیٰ پر پورا یقین ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو خیالات میں پاکیزگی اور معاملات میں صفائی پیدا کرتا ہے۔ پھر خیال اور عمل کی پاکیزگی کی وجہ سے انسان کو اس حد تک سرفرازی حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا والوں کا سردار تک بنا دیا جاتا ہے حضرت مریم علیہا السلام کے واقعے میں ارشاد ہے کہ

> "اے مریم، بے شک اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور آج سارے جہاں کی عورتوں پر تجھے پسند کیا"۔
>
> (سورہ۔ آل عمران، آیت ۴۳)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بھی اسی طرح کا بلند درجہ عطا فرمایا گیا ہے۔اس کی وجہ بھی وہی خیال اور عمل کی پاکیزگی ہے۔سورۃ الاحزاب (آیت ۳۳) میں ارشاد ہے:

"اور اپنے گھروں پر ٹھہری رہو اور بے پردہ نہ رہو، جیسے اگلی جاہلیت کی بے پردگی (تھی) اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو۔اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اے نبیؐ کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرمادے اور تمھیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے"۔

اس آیتِ کریمہ میں اہل بیت کی فضیلت کا ذکر ہے اور جس طرح حضرت مریم علیہا السلام کے مذکورہ بالا واقعے کے ساتھ تفسیر میں آتا ہے کہ انھوں نے اتنا طویل قیام کیا کہ ان کے قدم مبارک پر ورم آگیا اور پاؤں پھٹ کر خون جاری ہو گیا اسی طرح اہل بیتؓ کی عبادت کا ذکر بھی احادیث میں آتا ہے۔ان کی عبادت، گھر کا قیام، پردہ میں رہنا، زکوۃ کا ادا کرنا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تابعداری وغیرہ ایسے اعمال پاکیزہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرما کر انھیں فوقیت اور سربلندی عطا فرمائی۔

اسلامی عقائد جو عمل کی راہیں متعین کرتے ہیں، خیالات کو پاکیزہ بنانے کے لیے ہیں اور اللہ سے رشتہ مضبوط کرنے کے لیے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبروں، اس کی بھیجی ہوئی کتابوں، اس کے فرشتوں، قدر خیر و شر، موت کے بعد اٹھائے جانے اور آخرت کے دن کے متعلق جو تعلیم اسلام نے دی ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہے اور اس تعلیم کی بدولت دل میں حوصلہ، ہمت، آخرت کا خوف وغیرہ ایسے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو انسان کو برائیوں سے بچاتے ہیں اور اس کے خیالات کو گندہ اور پراگندہ نہیں ہونے دیتے۔

خیالات کی پاکیزگی سے اخلاق اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی نے اخلاق کے لیے ایسے نمونے چھوڑے ہیں کہ دنیا ان کی مثل بھی پیدا نہیں کر سکتی اور جو کچھ ارشاد فرمایا اس پر خود بھی عمل کر کے دکھایا۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ

"ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط بناتا ہے"۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہء قدرت میں میری جان ہے، انسان اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔

اس تاکید کے ساتھ جو ارشادات ہیں ان میں خیالات کی پاکیزگی کے لیے کس قدر اصرار ہے اور اس سے ہمارے معاشرے کی کس قدر اصلاح ہو سکتی ہے۔ پھر آپس میں محبت اور قومی یک جہتی کا کتنا اونچا معیار قائم ہو جاتا ہے۔

وہ خیالات کی پاکیزگی ہی ہے جو والدین، اولاد، عزیزوں، مسلمانوں اور عام انسانوں، بلکہ درختوں اور جانوروں کے حقوق ادا کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ والدین کے حقوق کے متعلق فرمایا:

"وہ تیرے لیے جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی"۔

اولاد کی تربیت کے لیے ارشاد فرمایا کہ

"انسان کا اپنی اولاد کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع خیرات کرنے سے بہتر ہے"۔

یہ بھی فرمایا کہ

باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ اچھی تربیت

ہے"۔ میاں بیوی کے حقوق، رشتے داروں کے حقوق، خادموں کے حقوق، مزدروں کے حقوق، یتیموں، بیواؤں، غریبوں، پڑوسیوں اور عام انسانوں کے جتنے حقوق ارشاد فرمائے ہیں، وہ سب کے سب خیالات کی پاکیزگی ہی کی تعلیم دیتے ہیں اور صرف ان حقوق کے ادا کرنے ہی سے بنی نوع انسان کی بھلائی، باہمی محبت اور خیر و فلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔

جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ نے مہاجر و انصار بھائی چارے کا رشتہ قائم فرمایا اور اسی طرح ہمہ گیر انسانی اخوت کی بنیاد ڈالی۔اس طرح تمام مسلمان ایک رشتہ۔ مواخات میں اس طرح منسلک ہو گئے کہ آپس میں کسی طرح کی کوئی تفریق اور بیگانگی نہ رہی۔سورۃ الحشر (آیت ۹) میں انصار کے جذبہ۔ایثار و قربانی کی اس طرح تعریف آئی ہے کہ

"جب ان کے پاس کوئی مہاجر ہجرت کر کے آتا ہے تو یہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور مال غنیمت وغیرہ میں سے مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے انصار مدینہ ان سے متعلق اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں رکھتے بلکہ ان سے اس قدر محبت رکھتے ہیں کہ ان کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان پر فاقہ ہی کیوں گزرے"۔

سورہ۔آل عمران (آیت ۱۰۳) میں بھی اس طرح ارشاد ہے کہ

"تم میں آپس میں دشمنی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی جس کی وجہ سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے"۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس شخص نے میری امت میں سے کسی شخص کی کوئی دینی یا دنیوی حاجت پوری کی اور اس نے اسے خوش کرنے کے لیے ایسا

کیا تو بلاشبہ اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے
اللہ تعالیٰ کو خوش کیا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا"۔

ان احادیثِ مبارکہ سے بھی ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہم ہر شخص کی بے لوث خدمت کرنے کو اپنا ایک مقصدِ حیات سمجھیں اور اس طرح کی سمجھ پیدا ہو گی تو ظاہر ہے کہ اس سمجھ اور ایسے خیال میں پاکیزگی ہی ہو گی اور ہر برائی کے جذبے سے دور ہو گی۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا، غم زدوں کا غم دور کرنا، اپنے پرائے کے ساتھ ہمدردی کرنا، دوسروں کی حاجت کو اپنی حاجت پر ترجیح دینا، قومی اداروں، اسکولوں، مدرسوں، ہسپتالوں اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں امداد دینا وغیرہ سب خیال کی پاکیزگی اور قلب و نظر کی مزکی ہونے کی دلیل ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے پیارے انداز میں فرمایا ہے کہ

"انسانوں میں اچھا وہ ہے جو انسانوں کو فائدہ پہنچائے"۔

ظاہر ہے کہ جس دین کی تعلیم یہ ہو وہ کتنا پاکیزہ ہو گا اور کس قدر خیر و فلاح کا منبع ہو گا۔ لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں نازل ہوں ان لوگوں پر جو ایسے خیالات اور جذبات اپنے دلوں میں رکھتے ہیں!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

مساوات

مساوات اور برابری انسان کی فطرت کی تقاضا ہے۔ اس کا پیدا ہونا، اس کا کھانا پینا، سونا جاگنا، رہنا سہنا، جینا مرنا اس کی زندگی کے لوازم میں سے ہے۔ جو پیدا ہوا ہے وہ ضرور کھائے گا، پیے گا، سوئے گا، جاگے اور پھر اسے مرنا بھی ہوگا، خواہ وہ کہیں رہتا ہو اور اس کے معاشرتی حالات کچھ ہی ہوں۔ یہ سب کچھ سب کے لیے اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنی خلقت میں ایک ہے۔ سورۃ السجدہ (آیت ۶-۹) میں ارشاد ہے:

"وہ ہے ہر نہاں اور ہر عیاں کا جاننے والا، عزت والا، رحمت والا، وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور پیدائش انسان کی ابتدا مٹی سے فرمائی۔ پھر اس کی نسل رکھی ایک بے قدر پانی کے خلاصے سے، پھر اسے ٹھیک کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل عطا فرمائے۔ کیا ہی تھوڑا شکر ادا کرتے ہو"۔

یعنی انسان جو مٹی سے پیدا ہوا ہے وہ کان، ناک، آنکھ، دل، دماغ اور اپنے حرکات و سکنات میں ایک ہی نہج پر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے حالات مختلف ہو جاتے ہیں اور تعلیم و تحصیل کے فرق کی وجہ سے اس کے معاملات میں یکسانیت نہیں رہتی۔ اس تفریق کے متعلق ایک لطیف اشارہ سورۃ النحل (آیت ۷۸) میں اس طرح آتا ہے:

"اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنا دیے،

تاکہ تم شکر ادا کرو"۔

تخلیق کے وقت انسان کچھ بھی نہیں جانتا تھا، پھر جاننے لگا۔ یعنی کان ملے تو قوتِ سامعہ سے اس نے کیا کیا سنا اور کیا کیا حاصل کیا۔ آنکھیں ملیں تو کیا کیا دیکھا، رحمتوں سے بھی مستفید ہوا اور زحمتوں سے بھی، بہت سے سبق حاصل کیے۔ دل ملا تو غلط اور صحیح کی تمیز ہوئی اور تحصیل علم کا جذبہ اور صلاحیت حاصل ہوئی۔ یہی وہ قوتیں ہیں جن پر تمام کمالات کی تحصیل کا دارومدار ہے۔ اور اللہ پاک نے ان قوتوں اور صلاحیتوں کے عطا کرنے میں کوئی تخصیص نہیں فرمائی۔ یعنی یہ تمام صلاحیتیں ہر انسان کے لیے عام ہیں۔ خواہ وہ اللہ پاک پر ایمان لائے یا نہ لائے، اس کے عام انعامات ہیں۔ یہ مساوات اس لیے بھی ہے کہ اس نے بنی آدم یعنی انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے اور مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے اسے سب پر فائق کیا ہے۔ سورہ۔ بنی اسرائیل (آیت ۷۰) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور بے شک ہم نے برتری دی آدم کی اولاد کو۔ اور خشکی و تری میں ان کو سوار کر دیا۔ اور عمدہ اور پاک چیزوں کی ان کو روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر ان کو فضیلت دی"۔

اس آیتِ کریمہ سے بھی واضح ہے کہ اللہ پاک نے اپنے انعامات، تمام بنی آدمی کے لیے عام کیے اور اس انعام میں اس نے قطعی مساوات کو قائم فرمایا ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت ۲۱۳) میں انسان کی مختصر تاریخ بھی مذکور ہے کہ اس کے لیے کس طرح برابری کے معاملات قائم کیے گئے ہیں اور کس کس طرح اسے نوازا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

"پہلے سب لوگ ایک ہی امت تھے۔ پس اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا جو (نیک عملی کی زندگی پر) بشارت دینے والے (بد عملی کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے۔ ان کے ساتھ برحق کتاب اتاری تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان کے جھگڑوں کا فیصلہ کریں۔

اختلاف انھیں لوگوں نے کیا تھا جن کو حق کا علم دیا گیا تھا اور واضح احکام ان کے پاس آگئے تھے۔ یہ آپس میں بغاوت اور زیادتی کی غرض سے تھا۔ پس اللہ نے ایمان والوں کی اپنے اذن سے سچائی کی طرف ہدایت کی جس میں اختلاف ہو گیا تھا۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کی راہ دکھاتا ہے۔"

اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کو ایک امت بنایا تھا اور ایک طریقے پر چلایا تھا، لیکن لوگوں نے اپنے فائدے اور خود غرضی کی وجہ سے ظلم اور سرکشی اختیار کی۔ یعنی جو حقوق سب کے لیے تھے، ان پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہا اور اسی غلط روی کی اصلاح کے لیے اور لوگوں کے باہمی اختلافات کو دور کرنے کے لیے پیغمبروں کو بھیجا گیا، جنھوں نے اللہ کا رشتہ مضبوط کرنا چاہا اور یہی رشتہ ایسا ہے جو سب کو ایک بناتا ہے اور سبھی کے حقوق کو پہچاننے کا سبق دیتا ہے۔ انسان کی اس مختصر تاریخ کے مطالعے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کے مساویانہ حقوق اللہ پاک کو کس قدر پسند ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ صرف اللہ کے سامنے جھکیں اور سب لوگ صرف اسی کی اطاعت کریں، تاکہ نظام معاشرت بگڑنے نہ پائے اور لوگوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔

ایمان، امن چاہتا ہے اور اسلام، سلامتی چاہتا ہے۔ جب ہمارا دین امن و سلامتی چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ہر معاملے میں مساوات کو قائم رکھے گا اور وہی تعلیم دے گا جس میں امن و سلامتی ہو۔ ایک اللہ کو ماننا، ایک رسول اور ایک کتاب کو ماننا بھی اسی لیے ہے۔ اس امن و سلامتی کو قائم رکھنے کے لیے اللہ کو ماننے کے بعد ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کے لیے سورہ بنی اسرائیل (آیت ۲۳) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم لوگ اس کے سوا کسی

کی عبادت نہ کرو اور والدین سے اچھا برتاؤ کرو اگر ان دونوں میں سے
کوئی ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کو تو اف
بھی نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکی دینا اور ان سے ادب سے بات کرنا اور
ان کے سامنے انکساری سے بازو جھکانا اور دعا کرتے رہنا کہ اے رب
رحم فرما ان پر، جس طرح بچپن میں انھوں نے میری پرورش کی ہے"۔

جو لوگ مساوات اور برابری کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ان کے یہاں ماں باپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انھیں بے یار و مددگار سرکاری نگرانی میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزارنے پڑتے ہیں، جہاں بیٹا اور بیٹی شاذو نادر ہی کبھی حال پوچھنے کو جاتی ہے اور اگر ماں باپ کبھی اپنی اولاد کو دیکھنے کے لیے ان کے یہاں جاتے ہیں تو اولاد ان کو کھلانے پلانے کا بل پیش کرتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک مسلمان خواہ وہ اسلام کے معاملے میں کمزور ہی کیوں نہ ہو، اپنے والدین کی خدمت کو بڑی سعادت سمجھتا ہے اور ان پر اپنی جان نچھاور کرنا چاہتا ہے۔ پھر یہ مسلمان دوسروں کے لیے بھی اپنی راحت کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ سورۃ الحشر (آیت ۹) میں ایسے مسلمانوں کے سلسلے میں ارشاد ہے کہ

"وہ (دوسروں کی حاجت کو) ترجیح دیتے ہیں اپنے اوپر، گو ان کو فاقہ ہو جائے"۔

تو جس قوم کی یہ خصوصیت ہو کہ وہ اللہ کی اطاعت کے بعد والدین کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھے اور دوسروں کی حاجت روائی میں ہر قربانی کے لیے تیار ہو، وہ کیوں کر مساوات، برابری، خلوص اور ایثار کو اپنا شیوہ نہ بنائے گی؟ ایسے دین والے جب کسی سے ملیں گے تو چھوٹے بڑے کی تفریق کے بغیر سلامتی کی دعا کریں گے۔

سورۃ النساء (آیت ۸۶) میں ارشاد ہے کہ

"جب تم کو سلامتی کی دعا دی جائے (یعنی السلام علیکم کہا
جائے) تو تم بھی اس سے زیادہ بہتر سلامتی کی دعا دو (مثلاً وعلیکم

السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کہو) یا اسی دعا کو لوٹا دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب رکھنے والا ہے"۔

دیکھیے ایسی دعا میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ پھر حکم ہے کہ (سورۃ البقرہ، آیت ۸۳) "لوگوں سے عمدہ طریقے سے بات کرو" یہاں بھی تفریق بڑے چھوٹے یا مذہب والے یا غیر مذہب والے کی نہیں ہے۔ لوگوں سے محبت اور اخلاق سے ملنا اور ان کی ہر خدمت کو تیار رہنا کتنی بڑی خوبی ہے اور اس برتاؤ میں سوائے مساوات کے کوئی کسی طرح کی تفریق نہیں ہے۔ جب مساوات کا جذبہ ہوگا اور کسی تفریق کا کوئی شائبہ ہی نہ ہوگا تو ایسا شخص ہر ایک کے حقوق ادا کرنا چاہے گا۔ اہل قرابت کے حقوق ہم سایے کے حقوق، یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کے حقوق، بیماروں، مہمانوں، غلاموں اور ملازموں کے حقوق اور عام انسانی برادری کے حقوق وہی شخص ادا کرے گا جس کے دل میں اپنی ذاتی فوقیت اور برتری کا جذبہ نہ ہوگا۔ ایسا شخص زبان و عمل میں سچا ہوگا، پاکباز ہوگا، شرم و حیا ہوگی، رحم و کرم والا ہوگا، عدل وانصاف کا دھنی ہوگا، عہد کا پابند ہوگا، احسان، عفو و درگذر، حلم و بردباری، تواضع و انکساری اور ہر وہ خوبی رکھتا ہوگا جو انسانیت کے لیے ضروری ہے اور جس سے ایک انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے۔ پھر اسلام کے جتنے ارکان ہیں ان میں کوئی تفریق نہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ میں کسی کے لیے کم یا زیادہ کا کوئی سوال نہیں، جیسا کہ بعض مذہبوں میں ہے کہ ان کے پیشواؤں پر پابندی نہیں۔ اسلام میں سب سے بڑا رکن نماز ہے اور اسی میں سب سے زیادہ مساوات ہے۔ مسجد میں جہاں بادشاہ کا سر ہوتا ہے وہیں فقیر اپنا قدم رکھتا ہے۔ بقول علامہ اقبال کے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

نماز کے لیے اذان ایک بادشاہ بھی کہنے کو تیار ہے اور امامت ایک فقیر عالم بھی

کر سکتا ہے ۔ زکوٰۃ کی شرح بادشاہ کے لیے زیادہ یا کم نہیں ۔ اسی طرح کسی صاحب نصاب کے لیے اس میں کوئی کمی یا اضافہ نہیں ۔ حج کے لیے جتنے مناسک ہیں، وہ چھوٹے بڑے سب کے لیے ضروری ہیں ۔ روزہ کا جو وقت ہے وہ بھی ہر چھوٹے بڑے کے لیے برابر ہے ۔ عدالت میں خلیفتہ المسلمین بھی ایک معمولی شخص کی طرح گواہی کے لیے پیش ہوتا ہے اور بڑے سے بڑے بادشاہ کو دین اور حق کے معاملے میں ایک فقیر بھی ٹوک سکتا ہے ۔ ملازم اور غلام اپنے آقا کے دسترخوان پر اپنے آقا ہی کی طرح بیٹھ کر کھاتا ہے اور اپنے آقا ہی کی طرح کپڑے پہننے کا حق رکھتا ہے اور اپنے آقا ہی کے برابر کام کرتا ہے ۔ کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے تو اس کی سزا میں بھی بڑے چھوٹے کی کوئی تفریق نہیں ۔ حق گوئی، شہادت، صلح و آشتی، اتحاد و اتفاق، انسانی برادری، ناپ تول، سخاوت اور تمام فضائل میں بڑے چھوٹے کی کوئی تفریق نہیں اور یہی مساوات آج بھی قائم ہے، جس کا ہر شخص کو اعتراف ہے ۔ اللہ پاک نے بنی نوع انسان کو " امتِ واحدہ " بنایا تھا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ **الخلق عیال اللہ** یعنی

کہ ہے ساری مخلوق، کنبہ خدا کا

فرد اور معاشرہ

اللہ پاک کا بے حد احسان ہے کہ اس نے انسان کی ایک ایسی جماعت تخلیق فرمائی جس میں افراد کے لیے بھی انعامات ہیں اور جماعت کے لیے بھی ہیں ۔ سورہ ابراہیم (آیت ۳۲۔۳۴) میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ابر سے پانی اتارا، پھر اس سے تمھاری روزی کے لیے مختلف پھل نکالے اور کشتیوں کو تمھارے قابو میں کر دیا کہ وہ دریا میں تمھارے حکم سے چلیں اور نہروں کو تمھارے اختیار میں دے دیا اور سورج اور چاند کو تمھارے کام میں لگا دیا جو چل رہے ہیں اور رات اور دن کو تمھارے قبضے میں دے دیا اور (ان کے علاوہ) جو کچھ تم مانگتے ہو، سب ہم دیتے ہیں ۔ اگر تم اللہ کی نعمت گنو تو نہیں گن سکتے"۔

اللہ پاک کی تمام نعمتیں مجموعی طور پر بھی حاصل ہوتی ہیں اور انفرادی طور پر بھی ملتی ہیں ۔ لیکن کوئی فرد اپنی جماعت یا معاشرے کے بغیر ان نعمتوں سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا ۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور دنیا کے تمام کاموں میں ہر شخص باہمی تعاون کا محتاج ہے ۔ ایک ہی شخص گندم کا بیج بو کر اس کی سیرابی کر کے، اس کو تیار کر کے، اس کی روٹی اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتا جب تک ہر ہر قدم پر اسے دوسروں کا تعاون حاصل نہ ہو ۔ گویا جماعت اور معاشرہ کے ربط اور تعلق ہی سے فرد کی زندگی بنتی ہے اور افراد کے مجموعے ہی کو جماعت اور معاشرہ کہتے ہیں ۔ علامہ اقبالؒ نے

خوب کہا ہے کہ

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

گویا فرد اور جماعت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ فرد نہ ہو تو جماعت نہیں ہو سکتی۔ اور جماعت افراد ہی کی مجموعی شکل کا دوسرا نام ہے۔ اللہ پاک نے فرد اور معاشرے دونوں کی ہدایت کے لیے سورہ۔ والعصر میں بہت جامع پروگرام عنایت فرمایا ہے کہ

"قسم ہے زمانے کی، کہ انسان (اپنی عمر ضائع کرنے کے اعتبار سے) بڑے گھاٹے میں ہے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے"۔

اس سورہ۔ مبارکہ میں (زمانے کی تاریخ کی طرف نظر کرنے کو فرماتے ہوئے) یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو تم کو معلوم ہو گا کہ وہ اپنی عمر ضائع کر کے بڑے گھاٹے میں پڑ جاتا ہے لیکن وہ فرد اور وہ انسان گھاٹے میں نہیں پڑتا جو ایمان لایا اور جس نے عمل صالح کیے اور وہ لوگ بھی (یعنی جماعت اور معاشرہ) گھاٹے میں نہیں ہیں جو ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تاکید کرتے ہیں۔ حق، باطل کی ضد ہے، یعنی ہر اچھائی حق کہلاتی ہے۔ اور صبر، جزع کی ضد ہے، یعنی بے قراری اور بے صبری جس کام میں نہ ہو وہ صبر کے ذیل میں ہے۔ اس سورہ۔ مبارکہ میں فرد کے لیے ایمان اور عمل صالح کی ہدایت ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک فرد کی اصلاح کے لیے کافی ہیں اور اسی سورت میں دو چیزیں جماعت اور معاشرے کی فلاح کے لیے ہیں کہ پوری جماعت ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تاکید کرے۔ اس طرح صالح اور ایمان والے لوگ ایک ایسی جماعت تیار کر سکیں گے جو حق اور صبر پر قائم ہو سکے گی۔ ایمان اور

عمل صالح نہ ہونے سے دنیا کے افراد جس طرح گھاٹے اور خسران میں مبتلا ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ۔ مغرب کے سنجیدہ لوگ چلا اٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے جو معاشرہ اپنایا ہے اس میں کہیں سکون نہیں ہے ۔ وہاں دل بہلانے کو اور سکون حاصل کرنے کے لیے غیر فطری طریقے بھی استعمال ہونے لگے ہیں اور خواب آور گولیوں کی خرید کے لیے دکانوں میں قطار لگانی پڑتی ہے ۔ لیکن ان کے برعکس جو لوگ ایمان اور عمل صالح والے ہیں وہ جھونپڑی میں بھی سکون کی نیند سوتے ہیں اور ایسے لوگوں کے معاشرے میں حق اور صبر ہی کارفرما ہوتا ہے ۔ سورۃ التغابن (آیت ۱۱) میں ایسے ایمان والے کے لیے ارشاد ہے کہ

"اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے، اللہ اس کے دل کو ہدایت فرما دیتا ہے" ۔

یہ ہدایت نیکی کی طرف ہوتی ہے، جس سے سکون، خیر، برکت، بھلائی سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے ۔ سورۃ الرعد (آیت ۲۹) میں ان برکتوں کے متعلق ارشاد ہے کہ:

"جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے، ان کے لیے خوش حالی ہے اور اچھا انجام ہے ۔"

یعنی اس دنیا میں بھی سکون اور عافیت ہے اور آخرت میں بھی درجات کی سرفرازی اور سربلندی حاصل ہوگی ۔ سورۃ النحل (آیت ۹۷) میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

"جو شخص عمل صالح کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہوگا تو ہم (دنیا میں) اسے اچھی زندگی سے زندہ رکھیں گے اور (آخرت میں) ان کے عمل کا بہترین اجر عطا کریں گے" ۔

اور دنیا میں ایسے لوگوں کو اللہ پاک اپنی خلافت سے بھی سرفراز فرمائے گا ۔ سورۃ النور (آیت ۵۵) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک عمل کیے ہیں کہ وہ ان کو زمین میں

خلیفہ بنائے گا، جس طرح اس نے خلیفہ بنایا تھا ان کو جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں۔ اور البتہ ان کے لیے دین کو مضبوط کر دے گا جس کو اس نے پسند کر لیا ہے اور وہ ان کے خوف کو دور کرنے کے بعد امن سے بدل دے گا"۔

دیکھیے اس آیت مبارکہ میں ایمان اور عمل صالح والے کے لیے کتنی نعمتوں کا ذکر ہے کہ یہی لوگ اس قدر نوازے جائیں گے کہ خلافت بھی عطا ہو گی اور ان کے دین میں اتنی پختگی ہو جائے گی کہ وہ غیر اللہ کے خوف سے بے نیاز ہو کر پورا پورا امن اور سکون حاصل کریں گے اور اگر ایمان اور عمل صالح کی دولت حاصل نہ ہوئی تو ہمیشہ تفرقہ ہی تفرقہ رہے گا۔ سورۃ الروم (آیت ۳۲) میں ایسے لوگوں کی حالت بیان فرمائی گئی ہے کہ:

"ان میں سے جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور کئی فرقے ہو گئے (ان میں سے نہ ہو جاؤ)۔ ہر گروہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں مگن ہے"۔

یعنی دین میں تفرقے ڈالنے والے صحیح ایمان سے محروم ہیں۔ ان کے دین میں پختگی کہاں ہے؟ اگر پختگی ہو گی تو وہ بھی امن میں رہیں گے اور دوسرے بھی امن اور سکون کے ساتھ رہیں گے۔ گویا ان کے تفرقے ہی دین کی کمزوری یا دین سے محرومی کی دلیل ہے۔ اسی لیے دنیا کی نام نہاد انجمنیں جو امن و امان کے لیے قائم کی جاتی ہیں وہ ہمیشہ آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور بڑے بڑے امن کے دعووں کے باوجود وہ پارٹیوں میں بٹی ہوئی رہتی ہیں۔ تو جب ایسی انجمنوں میں ہمیشہ پھوٹ ہے تو ان کے معاشرے میں کہاں اتحاد اور اتفاق ہو سکتا ہے؟ مغرب کے وہ لوگ جو خود کو بہت "روشن دماغ اور "وسیع القلب" کہتے ہیں، اپنے دین تک میں کالے گورے کی صف بندی کرتے ہیں اور قانون میں بھی رنگ و نسب کا امتیاز قائم رکھتے ہیں۔ گویا ان کا فرد اور ان کا معاشرہ

دونوں "طاغوتی" ہیں۔ سورۃ البقرہ (آیت ۲۵۷) میں ان کے لیے فرمایا گیا ہے کہ
"جو لوگ کافر ہیں ان کے یار مددگار طاغوت (شیطان) ہوتے ہیں"۔

ایسی تفریق اور نفاق رکھنے والوں کے متعلق قرآن پاک میں بکثرت مقامات پر ارشادات ہیں۔ مثلاً:

وہ خفیہ سازش کرتے ہیں (۴:۸۱)

کافر سے ساز باز اور دوستی رکھتے ہیں (۴:۱۳۹)

گناہ اور حرام خوری میں بے باک ہوتے ہیں (۵:۶۲)

فحش اور بد اخلاقی پھیلاتے ہیں (۲۴:۱۹)

جھوٹی تعریف کے حریص ہوتے ہیں (۲۶:۲۲۷)

غرض کہ فرد اور معاشرہ جبھی اچھا ہو سکتا ہے جب کہ ہر فرد میں (سورہ۔ والعصر کے مطابق) ایمان اور عمل صالح ہو اور معاشرے میں حق اور صبر کے اوصاف ہوں۔ ایسے فرد اور معاشرے ہی کی جماعت ہمیشہ سرفراز رہے گی۔ جیسا کہ مولانا حالی نے کہا ہے کہ

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت — جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
نہ شخصی بزرگی، نہ شخصی حکومت — رہی ہے، نہ ہرگز رہے گی سلامت
وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہوگی جڑ اس گلستاں میں جس کی

تکمیل دین کا مفہوم

اللہ پاک کا بے حد احسان ہے کہ اس نے انسان کو اپنا خلیفہ اور نائب بنایا اور اس کو وہ منصب عطا فرمایا جو کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں ۔ پھر اس منصب کی حفاظت اور بقا کے لیے بھی اس نے باقاعدہ انتظام فرمایا ۔ یعنی انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جنھوں نے صرف اللہ کے آگے جھکنا سکھایا اور انسان کو اس کے شرف اور عظمت کے مقام پر قائم رہنے کی تعلیم دی ۔ لا الہ الا اللہ کا مفہوم اور مقصود یہی تو ہے کہ انسان صرف اللہ کو اپنے سے بڑا سمجھے اور غیر اللہ کی نفی کرے سہتاں چہ توحید اس تخلیق کائنات کے لیے اساسی حیثیت رکھتی ہے، جس کے بغیر انسان، انسان ہی نہیں رہ سکتا اور اشرف المخلوقات نہیں کہلایا جا سکتا ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے وہ بھی توحید پر تو ضرور زور دیتے تھے کیوں کہ ایمان اور توحید لازم و ملزوم ہیں، لیکن چوں کہ وہ کسی مخصوص زمانے اور محدود معاشرے کے لیے تشریف لائے تھے، اس لیے ان کے پیام میں آفاقیت نہیں تھی سہچند مسائل اور چند ہدایات سے زیادہ خود مشہور صحیفوں میں بھی کچھ نہیں ہے ۔ توراۃ اور انجیل میں بے شک خدا کے وجود اور اس کی توحید کا بیان ہے، لیکن اس کے لیے براہین و دلائل نہیں ہیں ۔ حتیٰ کہ صفاتِ الٰہیہ، جو روح انسان کی بالیدگی اور خدا کی معرفت کے لیے ذریعہ ہیں، وہ بھی ان صحیفوں میں کہیں مذکور نہیں ۔ منصبِ رسالت، اس کی حقیقت، اس کے فضائل اور فرائض وغیرہ کا بھی کوئی ذکر نہیں ۔ جزا، سزا، دوزخ، جنت، حشر و نشر وغیرہ معتقدات کے محض دھندلے سے نشانات ہیں اور بس ۔ پھر عمل

سے متعلق بھی کوئی تفصیل موجود نہیں ۔ عمل کا پہلا جز عبادت ہے ۔ ان صحیفوں سے اس کے لیے طریقے، آداب، اور اوقات وغیرہ کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا ۔ اسی طرح خدا کی یاد اور اس کے لیے دعاؤں کی کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں ملتی ۔ یہی حال معاملات کے سلسلے میں ہے ۔ یعنی معاملات جو عمل کا دوسرا حصہ ہیں، ان کے لیے وہ اصول اور قواعد کلیہ ان صحیفوں میں نہیں ہیں جن کی روشنی میں انسانی مسئلے حل کیے جاسکیں ۔ پھر عمل کے ایک جز یعنی اخلاق سے متعلق بھی سوائے چند اچھائی اور برائی کی عام تعلیمات کے کوئی تفصیل کہیں مذکور نہیں ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تکمیل ایمان اور عمل صالح کے ذریعے فرمائی ۔ ایمان کے لیے توحید تو اساس ہی ہے، اس کے ذریعے انسان کو بتایا کہ وہ اللہ کا خلیفہ بھی ہے اور ساری کائنات اسی کے لیے بنائی گئی ہے ۔ سورۃ البقرہ (آیت ۲۹) میں ہے کہ:

"اسی نے تمھارے لیے جو کچھ زمین میں ہے پیدا کیا" ۔

سورۃ النحل (آیت ۱۰-۱۱) میں ہے:

"اسی (خدا) نے آسمان سے تمھارے لیے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تم پیتے ہو اور کچھ سے درخت لگتے ہیں ۔ جس میں جانور چراتے ہو ۔ وہی (خدا) تمھارے لیے کھیتی اور زیتون اور چھوہارے اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے" ۔

خشکی کی نعمتوں کے علاوہ دریا اور تری کی نعمتوں کا ذکر بھی اسی سورت (کی آیت ۱۴) میں ہے:

"اور وہی (خدا ہے) جس نے دریا کو کام میں لگایا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں سمندر کو پھاڑ کر چلتی ہیں اور تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور شاید کہ تم اس کا شکر کرو" ۔

انسانی روح کی تہذیب اور اس کی صلاحیتوں کی بیداری کے لیے یہاں تک فرما دیا جیسا کہ سورۃ الجاثیہ (آیت ۱۳) میں ہے کہ

"اور مسخر کر دیا تمھارے لیے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے
سب کا سب اس کی طرف سے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان
کے لیے جو غور کرتے ہیں"۔

ان آیات سے انسانی بیداری اور اس کی روحانی ترقی کے لیے کتنی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں، یہ سب کی سب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ظاہر ہوئی ہیں اور صرف انھی کے توسط سے انسانی عمل کے لیے زیادہ سے زیادہ اسباب کی نشان دہی فرمائی گئی ہے۔

دین کی تکمیل کے لیے دوسری چیز عمل صالح ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا جب غرق ہو گیا تو انھوں نے اللہ پاک کی بارگاہ میں اس کے متعلق عرض کیا۔ اللہ پاک نے (سورہ ہود، آیت ۴۶) فرمایا:

"اے نوح وہ تمھاری اہل میں سے نہیں ہے (کہ) اس کے
عمل صالح نہیں۔ پس مجھ سے وہ چیز نہ مانگ کہ جس کا تجھے علم نہیں
بے شک میں تجھے بتاتا ہوں کیوں کہ تجھے علم نہیں"۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہے کہ اہل وہی ہو سکتے ہیں جن کا عمل پیغمبر کی پیروی ہی ہو۔ اور اب چوں کہ تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت قائم و دائم ہے، اس لیے صرف ان کی پیروی کو عمل صالح کہا جائے گا۔ اللہ پاک نے انھیں تمام بنی نوع انسان کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ سورہ سبا (آیت ۲۸) میں ارشاد ہے:

"اور ہم نے نہیں بھیجا تم کو (اے محمدؐ!) مگر تمام انسانوں
کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والا"۔

اسی لیے سورۃ الاحزاب (آیت ۲۱) میں یہ ارشاد بھی ہے کہ

"بے شک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی میں (زندگی کا) بہترین لائحہ۔ عمل موجود ہے"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اسی لیے سراپا درس عمل ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل سے کوئی رہبری نہ فرماتے ہوں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، ملنا جلنا، آمدورفت، شادی بیاہ، دوست احباب، رزم و بزم، سفر و حضر، ہنسی مذاق، خلوت و جلوت وغیرہ کون سی چیز اور کون سا عمل ایسا ہے جو لائحہ۔ عمل نہ بن سکے؟ اللہ پاک نے قریب ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے اور ان میں سے کسی دو پیغمبروں کے درمیان چودہ سو سال نہیں گزرے، پھر بھی ان کی تعلیمات، ان کے اقوال، ان کے سوانح بلکہ ان کے تمام حالات محفوظ نہ رہے۔ لیکن ازل سے ابد تک اور آدمؑ سے لے کر تا این دم، پوری کائنات میں اگر کوئی ذات ایسی ہے اور ایسی ہو سکتی ہے جو اپنے ہر ہر عمل کی تاریخ پیش کر سکتی ہے تو وہ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، جس کے تمام مفصل و مکمل حالات ولادت سے لے کر وفات تک محفوظ و موجود ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اسی حیاتِ طیبہ کا نام تکمیل دین ہے اور اسی مقدس زندگی کی پیروی کا نام محبوبیت ہے۔ سورہ۔ آل عمران، (آیت ۳۱) میں ارشاد ہوتا ہے:

"اے لوگو اگر تم کو خدا کی محبت کا دعویٰ ہے تو میری پیروی کرو، پس اللہ تم کو اپنا محبوب بنا لے گا"۔

اس طرح اللہ کا محبوب بننا صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا دوسرا نام ہے، اسی لیے ہر دور کے اکابر نے اسی اسوہ۔ حسنہ کو ہر کمال کے لیے معراج اور منتہیٰ قرار دیا ہے۔

اور اس اسوہ۔ حسنہ سے ہٹنے کو شیطنت کہا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ۶۳ سال کی عمر میں سے ۲۳ سال خالص تبلیغی اور پیمبری شان کے گزرے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی ۴۰ سال کے حالات بھی ہم سے مخفی نہیں ہیں۔ آپؐ کی پیدائش، شیر خوارگی، طفلی، ہوش و تمیز، جوانی، پھر تجارت، سفر، آمدورفت، احباب، مشاغل، قوم قریش سے معاملات، قریش کے معاہدے میں شرکت، امانت داری، صداقت، خانہ داری، صلح جوئی، عزوات، تنہائی پسندی، غار حرا کی گوشہ نشینی وغیرہ کے وہ تمام حالات اور واقعات جو نبوت سے پہلے کے ہیں، سب کے سب تفصیل سے محفوظ ہیں اور یہ ایسی تفصیل ہے کہ آج تک کسی اور محبوب شخصیت کے یہ حالات اس طرح دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتے۔ گویا تمام و کمال اوصاف کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جینا اور دوسروں کو جلانا صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق بھی ہے اور منصب بھی۔ اللہ پاک نے دین و دنیا کی تمام نعمتوں کی تتمیم اور تکمیل آپ ہی کے ہاتھوں فرمائی ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت ۳) میں ارشاد ہے:

"آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کیا
اور اپنی نعمت کو تمھارے لیے پورا کیا اور تمھارے لیے اسلام ہی کو
دین پسند کیا"۔

گویا جب سے دنیا قائم ہے، دین اور نعمت درجہ بدرجہ اور عہد بہ عہد قائم ہے، لیکن اس کی تکمیل و تتمیم اب ہوئی ہے اور اب اس پر کسی طرح کا کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی لیے آخری رسول بھی ہیں اور ان کے بعد صرف ان کی شریعت کو دوام حاصل رہے گا اور جو شخص ان کے طریقوں سے روگردانی کرے گا وہ نہ صرف دین سے لاعلم ہے بلکہ اس پر ہمیشہ کے لیے اللہ کا غضب ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۱۱۵) میں ارشاد ہے:

" جو شخص ہدایت کی راہ خود پر واضح ہو جانے کے بعد بھی

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گے اور مومنوں کے طریقے سے ہٹ کر دوسرے راستوں پر چلے گا تو جتنا وہ حضورؐ سے روگردانی کرے گا، ہم بھی اتنا ہی اس سے اعراض کریں گے اور اسے داخل جہنم کر دیں گے، جو بہت برا ٹھکانا ہے"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ جو تکمیل دین کے لیے حتمی سند ہے، حالی کی زبان سے اس طرح مذکور ہے:

حقیقت کا گر ان کو اک اک بتایا　　سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا
بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا　　زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا

کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اٹھا کر

ایفائے عہد

عہد اور وعدہ ان تمام معاملات کو شامل ہے جن کی ذمہ داری اپنے اوپر لی جائے، خواہ اس ذمہ داری کے لیے کوئی قسم کھائی جائے یا نہیں، اور خواہ وہ عہد کسی کام کرنے کے متعلق ہو، یا نہ کرنے سے تعلق رکھتا ہو اور کسی سے معاہدہ کر کے عہد شکنی کرنا حرام اور بہت بڑا گناہ ہے۔ عہد دو طرح کا ہوتا ہے:

ایک وہ ہے جو بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ عہد ایمان لانے پر احکام الٰہی کی پابندی ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔

دوسرا عہد وہ ہے جو ایک شخص دوسرے شخص سے کرتا ہے، یا ایک جماعت دوسری جماعت سے کرتی ہے۔ اس میں وہ تمام سیاسی، تجارتی اور دوسرے معاہدات شامل ہیں جو افراد، جماعتوں یا حکومتوں کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔

ایسے معاہدات اگر شریعت کے خلاف نہ ہوں تو ان کا پورا کرنا بھی واجب ہے اور اس طرح بڑا وقار قائم ہوتا ہے۔ اگر وہ معاہدات شریعت کے خلاف ہوں تو دوسرے فریق کو اس کی اطلاع کر کے ان کو ختم کر دینا واجب ہے۔ ایسے عمل سے بھی قومی وقار بلند ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ

"بہت کم ایسا ہوا ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو خطاب فرمایا ہو اور ایسا نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہ ہو اس کا ایمان کامل نہیں اور جو شخص عہد کی پابندی نہیں کرتا،

اس کا دین کامل نہیں"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم امانت داری اور ایفاے عہد کے لیے بہت زیادہ تاکید فرمایا کرتے تھے: کیوں کہ یہ دونوں چیزیں اصلاح معاشرہ اور اتحادِ باہمی کے لیے ازبس ضروری ہیں اور ان کو ملحوظ نہ رکھنے سے انفرادی اور اجتماعی برائیاں بہت زیادہ پیدا ہو جاتی ہیں ۔ایک حدیث میں امانت داری اور ایفاے عہد کو دین کی تکمیل کا ذریعہ بھی فرمایا ہے ۔خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداے زندگی ہی سے ان دونوں خوبیوں کا ایسا کامل مظاہرہ فرمایا تھا کہ مشرکین بھی ہر زمانے میں آپؑ کو صادق اور امین ہی کہا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں کئی جگہ ایفاے عہد کے لیے حکم فرمایا ہے ۔ سورۃ النحل (آیت ۹۱) میں ارشاد ہے:

"جب تم آپس میں عہد کرو تو اس عہد کو پورا کرو اور پکی قسم
کھانے کے بعد ان کو نہ توڑو اور تم نے اللہ تعالیٰ کو ضامن بنایا ہے
اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے"۔

یہ ارشاد ایفاے عہد کے لیے ہے، لیکن اگر ہمارا فریق خود ہی عہد کو توڑ دے تو پھر ہم کو اپنے عہد پر قائم رہنے کی ضرورت نہیں ۔چناں چہ سورۃ التوبہ کے شروع ہی میں اس کا ذکر آتا ہے کہ جب کفار نے وہ عہد جو مسلمانوں سے کیا تھا، توڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم کو بھی اپنے عہد پر قائم رہنا ضروری نہیں ۔اس سورت کی ابتدائی دو آیتیں یہ ہیں جو سنہ ۰۹ ہجری والے حج کے موقع سے متعلق ہیں۔

"اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں کے ساتھ ،
جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا، بیزاری اور جنگ کی تیاری ہے ۔تو
(اے مشرکو!) تم زمین میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ
تعالیٰ کو عاجز نہ کر سکو گے اور یہ بھی (جان لو) کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو

رسوا کرنے والا ہے "۔(سورۃ التوبہ، آیت ۱۔۲)

یعنی کافروں کی عہد شکنی کے بعد بھی چار ماہ کے لیے ان کو مہلت اور سہولت دی گئی تھی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو بھی ایفائے عہد کے لیے تاکید فرمائی ہے، جو اسلام سے پہلے کبھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

"مجھے قریش نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ میں نے آپؐ کو دیکھا تو میرے دل میں ایمان کا نور چمک اٹھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! خدا کی قسم میں قریش کی طرف ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں عہد شکنی کرنا نہیں چاہتا، تم واپس جاؤ، تمھارے جو خیالات اب ہیں، اگر یہی رہے تو واپس آجانا "۔ حضرت ابو رافعؓ فرماتے ہیں کہ میں چلا گیا اور دوسری دفعہ حاضر خدمت ہو کر اسلام لایا۔"

ایفائے عہد کا ایک شان دار واقعہ بیعت الرضوان والا بھی ہے۔ یعنی سنہ ۰۶۔ ہجری میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپؐ نے اور صحابہ کرامؓ نے (عمرہ کے لیے) سر صاف کرایا ہے یا بال کتروائے ہیں۔ اس خواب کے بعد آپؐ مع صحابہ کرامؓ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ جب آپؐ عسفان پہنچے تو آپؐ کو بشیر بن سفیان نے خبر دی کہ آپؐ کی روانگی کی خبر سن کر قریش بہت بڑی جمعیت کے ساتھ نکلے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو جہاد کر کے فتح و غلبہ حاصل کریں یا جان دے دیں۔ چناں چہ آپؐ روانہ ہوئے اور حدیبیہ کے پرلے سرے پر جا اترے۔ وہاں آپؐ کے پاس قریش کے کئی افراد پے در پے آئے۔ آپؐ ان سے یہی فرماتے تھے کہ ہم تو صرف زیارتِ کعبہ کے لیے آئے ہیں، جنگ و جدل کے لیے نہیں آئے۔ آخر کار جو

معاہدہ ہوا اس پر مسلمانوں نے سختی سے عمل کیا۔ اس کی تفصیل کتابوں میں ہے، جس سے ظاہر ہے کہ مسلمان ہر قیمت پر ایفائے عہد کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

سورہ۔ بنی اسرائیل (آیت ۳۴) میں ارشاد ہے کہ:

"اور اپنا عہد پورا کرو۔ بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث میں ایفائے عہد کے لیے ارشادات ہیں۔ ایک مواقع پر فرمایا کہ

"نہ اپنے بھائی سے جھگڑا کرو، نہ اس سے بے جا مزاح کرو اور نہ ایسا وعدہ کرو جس کی خلاف ورزی ہو"۔

ایک اور وقت یہاں تک فرمایا کہ

"دھاگا اور سوئی تک ادا کرو اور خیانت سے بچو"۔

یعنی اگر وعدہ ہے تو ذرا ذرا سی بات پر بھی عمل ہونا چاہیے اور دنیا کے فائدے کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد سورۃ النحل (آیت ۹۵) میں اس طرح ہے:

"اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیا کے فائدے) کے بدلے میں نہ خریدو"۔

ایفائے عہد سے متعلق ایک غیر معمولی واقعہ بچوں کی کتاب میں بھی درج ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان کے ہاتھوں ایک بوڑھا شخص مارا گیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قصاص کا حکم دیا، لیکن اس نوجوان نے عرض کیا کہ مجھ پر ایک یہودی کا قرض ہے، مجھے اجازت دی جائے کہ سزا سے پہلے اسے میں ادا کر دوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "تمھیں ضمانت پر آزاد کیا جاسکتا ہے"۔ لیکن اس نوجوان کا کوئی بھی واقف نہ تھا۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اس کی ضمانت لے لی کہ وہ آخر دینی بھائی تو تھا۔ چناں چہ وہ ایک مقررہ مدت کے لیے آزاد کر

دیا گیا۔ وہ اپنے گھر گیا، یہودی کا قرض ادا کیا اور واپس آنے لگا کہ اس کی سانڈنی کا تنگ ٹوٹ گیا اور اسے مقررہ دن میں پہنچتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ اگر وہ نوجوان وقت پر نہیں پہنچا تو حضرت ابو ذرؓ قتل کر دیے جائیں گے۔ جلاد تلوار لے کر آ بھی گیا۔ اتنے میں دور سے گرد و غبار اٹھتا ہوا نظر آیا اور وہ نوجوان سزا بھگتنے کے لیے آپہنچا۔ نوجوان کی اس شرافت اور ایفائے عہد کے پاس کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے اور آپؓ نے اس نوجوان کو رہا کر دیا۔

ایفائے عہد کے ایسے بے مثل واقعے کو آج کی تاریخ کے ہزاروں اوراق میں بھی پھر کسی نے نہیں دیکھا اور شاید نہ دیکھے گا۔ یہ سب کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا صدقہ ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بدگمانی

لفظ بدگمانی خود ہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بری چیز ہے اور وہ جب بری چیز ہے تو ظاہر ہے کہ اسے کیوں کر اچھا کہا جائے گا۔ سورہ یونس (آیت ۳۶) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

بے شک گمان کچھ کام نہیں دیتا۔ حقیقت کے لیے "۔ یعنی حقیقت کی تلاش کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے، گمان کی ضرورت نہیں۔ کسی کام میں کامیابی اور کسی مقصد تک رسائی کے لیے صرف سوچنا کافی نہیں۔ اسی لیے بہت سے فلاسفہ، جو زندگی کے حقائق پر غور کرتے ہیں، لیکن ان کی عملی تبلیغ نہیں کرتے، وہ کتابوں میں تو یاد کر لیے جاتے ہیں، عملی زندگی میں ان سے کوئی بھی مستفیض نہیں ہو سکتا۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال مرحوم نے بھی ایسے گمان، ایسے علم اور ایسے فلسفے کو بے کار قرار دیا ہے جو صرف سوچنا سکھائے اور عمل کے لیے آمادہ نہ کرے۔ وہ کہتے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

یعنی گمان کی بہترین صورت عقل ہے، تو وہ عقل بھی بے کار ہے جو منزل مقصود تک نہ پہنچا دے۔ دراصل گمان اگر نیک خیال ہے تو وہ عقل، علم اور عمل سب کے لیے کارآمد ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں ہے تو وہ گمان نہ تو مفید ہے اور نہ وہ حقیقت تک رسائی کے لیے معاون ہے۔ سورۃ النور (آیت ۱۲) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

" ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں آپس میں نیک

خیال (نیک گمان) رکھتے ہیں"۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہے کہ ایمان والے لوگ ہی نیک گمان ہوتے ہیں، یا نیک گمان لوگ ہی ایمان والے ہوتے ہیں۔ گویا بدگمانی ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتی، کیوں کہ یہ ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جو سچے دین دار مسلمان کے منصب کے منافی ہے۔ جو شخص نیک گمان ہوتا ہے وہ ہر شخص کے کام میں اچھائی تلاش کرتا ہے، بلکہ اس کی برائی کی بھی تاویل کرلیتا ہے، لیکن جو شخص بدگمان ہوتا ہے اسے ہر شخص کی اچھائی میں بھی برائی نظر آتی ہے، یعنی خود کی برائی کو وہ دوسرے کے آئینے میں دیکھتا ہے اور اپنے آئینہ ، دل کو مکدر بنالیتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بدگمانی کے کیا کیا نتائج ہیں؟ ارشاد ہوتا ہے کہ

"تم بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو اور نہ آپس میں حسد رکھو اور نہ بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے، آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔"

اس حدیث مبارکہ میں بظاہر مختلف رذائل سے بچنے کے لیے ارشاد ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام رذائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یعنی بدگمانی سے ان کی تخلیق ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو اسی بات کی برائی پر نظر ہونی چاہیے کہ بدگمانی کو سب سے جھوٹی بات فرمایا گیا ہے۔ یعنی حقیقت کچھ ہوتی ہے لیکن بدگمانی کی وجہ سے وہ حقیقت محض جھوٹ نظر آتی ہے اور جس کے متعلق بدگمانی کی جائے، وہ لاکھ اچھا ہو لیکن بدگمانی کرنے والا اسے برا ہی سمجھتا ہے۔ پھر اسی حدیث میں ارشاد ہے کہ "دوسرے کے ٹوہ میں نہ رہا کرو"۔ یہ بات بھی بدگمانی کا نتیجہ ہے۔ یعنی جو شخص کسی

کے متعلق بدگمان ہوگا وہ اسی ٹوہ میں لگا رہے گا کہ اس شخص کی خامیاں کیا ہیں اور بدگمانی کی وجہ سے اس شخص کی ہر خوبی، خامی ہی نظر آئے گی، مختلف شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور نفس یہی کہے گا کہ وہ شخص بے شک برا ہے اور اس میں جو چیز بظاہر اچھی نظر آرہی ہے وہ ہرگز اچھی نہیں ہے، بلکہ اس شخص نے عیاری اور چالاکی سے اپنی برائی اور خامی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس کے بعد اسی حدیث میں (بدگمانی کے عواقب میں) یہ بھی ارشاد ہے کہ: "ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس نہ کرو"۔ یعنی جب بدگمانی ہوگی تو نفس یہی کہے گا کہ فلاں شخص جس کے متعلق بدگمانی ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کو شکست دینی چاہیے اور اس کو زک پہنچا کر خود کو اس سے بہتر ثابت کرنا چاہیے۔

گویا اس حدیث پاک میں جو آگے ارشاد ہے کہ: "آپس میں حسد نہ رکھو اور نہ بغض رکھو"۔ تو بدگمانی کی وجہ سے اس شخص پر بڑھنے کی بے جا ہوس کے بعد حسد اور بغض بھی اپنا کام کرے گا اور نفس یہی کہے گا کہ وہ شخص خوامخواہ ترقی کر گیا ہے۔ وہ اس ترقی اور عروج کا اہل نہیں ہے۔ میں اس کا اہل ہوں اور مجھے ویسا عروج حاصل ہونا تھا، کیوں کہ میں بہت قابل ہوں اور ہر طرح کی صلاحیت رکھتا ہوں اور وہ شخص تو محض فریب دے کر ترقی کر گیا ہے، ورنہ اسے آتا کیا ہے۔ جب بدگمان شخص ان برائیوں کی منزلوں سے بھی گزر جاتا ہے تو پھر اسے اس شخص سے ایسی نفرت ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوتا، اس لیے اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اس حدیث پاک میں اسی سلسلے میں ارشاد ہے کہ "ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو"۔ یہ ارشاد اسی لیے ہے کہ بدگمانی کرنے والا شخص جب (۱) دوسرے کے ٹوہ میں لگا رہے گا، جب (۲) اس پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرے گا، جب (۳) اس سے حسد کرے گا، جب (۴) اس سے بغض رکھے گا اور جب (۵) اس سے منہ پھیرے گا، تو ظاہر ہے کہ وہ اس کا بھائی نہ رہے گا اور جو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ" تو وہ اس

ارشاد کی تعمیل سے بھی محروم ہو جائے گا۔ غرض کہ ایک بدگمانی کی وجہ سے اسے کتنے رذائل اور کتنی برائیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور پھر وہ اپنے بھائی کو بھائی نہیں، بلکہ دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح اسلام کا نظام معاشرت ناکام بن جاتا ہے اور وہ دین جو حقوق العباد پر زیادہ زور دیتا ہے، یک لخت ایک بدگمان شخص سے دور ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ شخص تمام فضائل اور تمام نیکیوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ایسے شخص کو سورۃ الحجرات (آیت ۱۲) میں بھی تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ

"اے ایمان والو، بہت بدگمانی سے بچا کرو۔ بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے"۔

اس آیت مبارکہ کے سلسلے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ گمان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک گمان واجب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان کرنا، ایک گمان مستحب ہے، یعنی مومن صالح کے ساتھ نیک گمان کرنا۔ ایک گمان ممنوع اور حرام ہے، یعنی اللہ کے ساتھ اور مومن کے ساتھ برا گمان کرنا۔ البتہ ایک گمان جائز ہے، یعنی فاسق کے ساتھ ایسا گمان کرنا جیسا کہ اس کے برے افعال سے ظاہر ہوتا ہو۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ آیت مبارکہ میں جو گمان سے بچنے کے لیے حکم ہے، تو وجہ یہ ہے کہ ہر گمان صحیح نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح بدگمانی سے انسان بچ سکتا ہے اور اس بدگمانی کے عذاب سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے۔! ایک مومن صالح کے ساتھ اسی لیے برا گمان ممنوع ہے کہ اس کی بات سن کر فاسد معنی لیے جائیں حالاں کہ اس کے صحیح معنی نکلتے ہوں۔ اور حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا ہے کہ گمان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ دل میں گمان آئے اور زبان سے بھی کہہ دیا جائے۔ اگر یہ گمان ایسا ہے کہ مسلمان کی بدی ہوتی ہے، تو یہ گناہ ہے۔ اور دوسری قسم یہ ہے کہ دل میں گمان آئے اور زبان سے نہ کہا جائے۔ یہ اگرچہ گناہ نہیں، لیکن دل کو اس سے بھی خالی کرنا ضروری ہے۔ بہرحال ہر وہ گمان جس کی وجہ سے دل میں بدی آئے ممنوع ہے اور ہماری قوم اگر ایسے ظن و گمان سے بچتی رہے تو ہماری بہت سی معاشرتی برائیاں اور مناقشے آسانی سے دور ہو سکتے

ہیں۔آخر میں پھر ایک حدیث سے ہماری رہبری ہو سکتی ہے۔ارشاد ہے:

"گمان سے بچو، گمان بڑی جھوٹی بات ہے اور مسلمانوں کی عیب جوئی مت کرو۔ان کے ساتھ حرص و حسد، بغض اور بے مروتی نہ کرو۔اے اللہ کے بندو! بھائی بنے رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔اس پر ظلم نہ کرے، اس کو رسوا نہ کرے، اس کی تحقیر نہ کرے۔تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے (تین مرتبہ فرمایا)۔آدمی کے لیے یہ برائی بہت ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کو حقیر دیکھے۔ہر مسلمان، مسلمان پر حرام ہے۔اس کا خون بھی، اس کی آبرو بھی، اس کا مال بھی۔اللہ تعالیٰ تمھارے جسموں، صورتوں اور عملوں کو نہیں دیکھتا لیکن تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے"۔

عیب پوشی

قرآن، امن و امان اور صلح و آشتی کا پیام لے کر آیا ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسے معاشرے کی تخلیق ہے، جو ہر اچھائی کو اپنائے اور ہر برائی کو دور کرے، تا کہ بنی نوع انسان کو پر سکون زندگی حاصل ہو اور اس کے تمام معاملات خیر و فلاح کے ضامن ہوں۔ ایسی زندگی کے لیے حکومت کی قوت سے زیادہ اخلاق کی قوت مفید ہے، کیوں کہ اخلاق ہی سے باہمی تعلقات مستحکم ہو سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا، باہمی امداد، ایثار و قربانی اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا صرف اخلاق کی قوت سے ممکن ہے اور یہی قوت ایک معاشرے کے لیے روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اخلاق ہی کی قوت سے ہمارے عیوب اور ہمارے رذائل دور ہو سکتے ہیں۔ حکومت ہمارے جھوٹ، غیبت، چغلی، عیب جوئی، خود فریبی، خود نمائی، ریا اور مکاری وغیرہ عیوب پر کہاں تک قدغن لگائے گی اور اس کا فائدہ بھی کیا ہوگا؟ ان رذائل کو اخلاق اور باہمی اخلاص ہی سے دور کیا جا سکتا ہے اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیام کا اصل مقصد اخلاق ہی کی تبلیغ ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں تو اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔

اور اسی تبلیغ کی خوبیوں کا ذکر سورۃ الفرقان (آیت ۶۳۔۷۴) میں اس طرح آتا ہے کہ

"اور رحم کرنے والے اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب نا سمجھ لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ سلام کرتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کے لیے قیام اور سجدہ میں رات گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب دور کر کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے اور جہنم بُرا ٹھکانا اور مقام ہے۔ اور جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان دونوں کے درمیان سے وہ سیدھے گزرتے ہیں اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو خدا نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو اللہ نے منع کیا ہے اور نہ وہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب وہ کسی لغو بات پر گزر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گزر جاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ غور وفکر سے سنتے ہیں) اور وہ دعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچوں کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا"۔

ان آیاتِ مبارکہ سے کتنے اخلاقی پیامات حاصل ہوتے ہیں کہ عفو و درگذر بھی ہو، میانہ روی بھی ہو، قتلِ وخون ریزی اور بدکاری نہ ہو، مکاری اور فریب کاری نہ ہو اور ایسے حالات نہ ہوں جن سے معاشرے کا سکون اور چین ختم جائے۔

اخلاقی رذائل میں عیب جوئی بہت بڑی لعنت ہے۔ اس برائی سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ کون ہے جس میں کوئی نہ کوئی خامی نہ ہو اور اگر خامی نہ بھی ہو تب بھی انسانی بلکہ طاغوتی فطرت ایسی ہے کہ دوسرے کی خوبی کو بھی خامی سمجھ لینا مشکل

نہیں ہے سچتاں چہ یہ برائی جب کسی شخص میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہر برے اور اچھے انسان میں کیڑے نکالتا ہے اور فتنہ و فساد پھیلاتا کرتا ہے ۔یہ لعنت الیکشن کے زمانے میں عام ہو جاتی ہے ۔ اور غیبت اور عیب جوئی کو ہنر سمجھا جانے لگتا ہے ۔ سورۃ الحجرات (آیت ۹۔۱۱) میں واضح الفاظ میں ہمارے معاشرے کی انھی برائیوں کی نشان دہی فرمائی گئی ہے ۔ارشاد ہے:

"اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو ۔ اور ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے ۔پس جب وہ رجوع ہو جائے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے ۔اے مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں، عورتوں سے (تمسخر کریں)، ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں ۔اور اپنے (مومن) بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو ۔ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) گناہ ہے اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں"۔

پھر اسی سورہ مبارکہ (آیت ۱۲۔۱۳) میں ہمارے معاشرے کی دوسری برائیوں کا ذکر بھی ہے ۔ارشاد ہے کہ:

"اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں ۔اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے ۔کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے ؟ اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا ڈر رکھو ۔بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ۔لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے

پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو (اور) خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک خدا سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے"۔

سورۃ الحجرات کی ان آیتوں میں آپس کے لڑائی جھگڑے، ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی، تمسخر کرنا، عیب جوئی کرنا، ایک دوسرے کا برا نام رکھنا، بدگمانی کرنا، کسی کے عیب کی ٹوہ لگانا، غیبت کرنا وغیرہ عیوب سے احتراز کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ سب برائیاں ہمارے معاشرے کے سکون کو تباہ کرنے والی ہیں۔

لیکن اگر ہم اپنے بھائی کی خامیوں اور برائیوں پر پردہ ڈالیں اور درگزر کو اپنا شیوہ بنائیں، غیبت کرنے سے اجتناب کریں، برے نام رکھنے اور برا کہنے سے گریز کریں، کسی کا مذاق نہ اڑائیں، کسی میں عیب نہ لگائیں، بدگمانی نہ کریں، ظلم و زیادتی نہ کریں اور اپنے مومن بھائی کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ کر اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈالیں تو معاشرے میں کس قدر باہمی محبت اور الفت پیدا ہو سکتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں"۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: "مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بددعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے"۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے، جو (مومن) اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہو گا، اللہ اس کی مدد میں ہو گا۔ جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا، اللہ اس کی مصیبت کو دور فرمائے گا"۔

ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو عورتوں کا ذکر آیا کہ ایک عورت رات بھر نمازیں پڑھتی تھی، دن کو روزہ رکھتی تھی اور صدقہ دیتی تھی مگر

اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کو ہر وقت پریشان کرتی تھی ۔دوسری خاتون ایسی تھیں کہ وہ صرف فرض نماز پڑھتی تھیں ۔ غریبوں کو کپڑے تقسیم کرتی تھیں اور کسی کی عیب جوئی نہیں کرتی تھیں اور نہ کسی کو تکلیف ہونے دیتی تھیں ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (وہ عورت جو عیب جوئی کرتی اور زبان درازی کرتی ہے) اس میں کوئی نیکی نہیں ۔وہ اپنی بد خلقی کی سزا بھگتے گی "۔دوسری خاتون کے متعلق فرمایا کہ "وہ جنتی ہو گی "۔اس واقعے ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عیب جوئی اور عیب پوشی سے کیا سزا اور کیا جزا ملے گی!

صلح صفائی

لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانا، ان کے اختلافات کو دور کرنا اور ان کے جھگڑوں کو مٹا کر ان میں محبت اور اتفاق پیدا کرانا بہت بڑی نیکی ہے۔ قرآن پاک میں کئی واقعات کی طرف اشارہ ہے جب کہ صلح صفائی کی ضرورت محسوس ہوئی اور اختلافات دور کیے گئے۔ سورۃ الانفال کی پہلی آیت ہے کہ

"یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں اور رسول کی ہیں۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو۔ اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم ایمان والے ہو"۔

اس آیت مبارکہ کی شان نزول سے متعلق کئی روایتیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے (بدر کی جنگ کے وقت) یہ اعلان فرما دیا تھا کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا یا قید کرے گا اسے اتنا اتنا انعام ملے گا۔ فتح کے وقت بوڑھے لوگ تو جھنڈوں کے نیچے رہے اور جوان لوگ قتل و غنیمت کی طرف دوڑے۔ بوڑھوں نے ان جوانوں سے کہا کہ ہم کو بھی اس میں شریک کرو کہ تمھارے مددگار تھے اور تم پر کوئی حادثہ پڑتا تو تم ہماری ہی پناہ لیتے۔ اس میں گفتگو ہو گئی اور حضورؐ تک مقدمہ آیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور حضورؐ نے بوڑھے اور نوجوان سب کو برابر برابر حصہ تقسیم فرما دیا۔ لیکن پوری آیت مذکورہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا کی حرص مت کرو بلکہ آخرت کے طالب بنو، اس طرح کہ اللہ سے

ڈالو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو۔ دراصل اللہ کی اطاعت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔

سورۃ النساء (آیت ۱۲۸) میں ارشاد ہے کہ

"اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بددماغی یا بے پروائی کا ہو تو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کرلیں اور یہ صلح بہتر ہے اور نفوس کو حرص سے تعلق ہوتا ہے اور اگر تم اچھا برتاؤ رکھو اور احتیاط رکھو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے"۔

یہ آیت مبارکہ شوہر اور بیوی کی باہمی صلح کے لیے ہے۔ یعنی اگر عورت ایسے شوہر کے پاس رہنا چاہے جو اس کے پورے حقوق ادا کرنا نہیں چاہتا اور اسی لیے اس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو عورت کو جائز ہے کہ وہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ دے، مثلاً نان و نفقہ معاف کر دے یا مقدار کم کر دے اور اپنی باری معاف کر دے تاکہ شوہر اسے نہ چھوڑے اور شوہر کو جائز ہے کہ اس معافی کو قبول کر لے۔ یعنی ایسی صلح نزاع اور اختلاف کو برقرار رکھنے سے بہتر ہے ہرچند چہ شوہر کو جب معلوم ہو جائے گا کہ اسے بیوی کی طرف سے ایسی رعایت مل رہی ہے تو وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہے گا۔ بہرحال اس صلح میں کوئی اور شرط ہو جو شرعاً جائز نہ ہو تو وہ اس صلح کو بھی ناجائز کر دے گی۔ یعنی اس موقع پر بھی شرع کی حدود میں رہ کر ہی صلح صحیح اور جائز کہلائے گی ورنہ نہیں۔

ایک اور صلح کا ذکر سورۃ الحجرات (آیت ۹-۱۰) میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے۔ پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان

دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کا خیال
رکھو۔ بے شک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو سب
بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو اور اللہ
سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے"۔

ان آیتوں میں نفسانی غرض کو دور کر کے صرف اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنا سکھایا جارہا ہے۔ بعض دوسرے مسائل کا استخراج بھی ان آیتوں سے کیا جاتا ہے، لیکن اصل غرض صرف اللہ کے لیے غرض ہے اور کچھ نہیں۔ اگر آپس میں صلح صفائی نہ ہو تو سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"کسی شخص کے لیے یہ بات حلال نہیں کہ اپنے بھائی سے
تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے، اس طرح کہ دونوں ملیں اور یہ
ادھر کو منہ پھیر لے اور وہ ادھر کو منہ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں اچھا
وہ شخص ہے جو پہلے سلام کرے"۔

لیکن افسوس ہے کہ ہم لوگ سلام کرنے میں پہل کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

ایک حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمان کو (بلاوجہ) برا بھلا کہنا بڑا گناہ ہے اور اس سے
(بلاوجہ) لڑنا (قریب) کفر کے ہے"۔

دیکھیے ہم ایسے گناہ کتنے زیادہ کرتے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ پھر لطف یہ ہے کہ ایک مسلمان کے خلاف لوگ سنتے بھی ہیں تو صلح صفائی نہیں کراتے بلکہ اس کینہ اور عداوت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور ہر ایک کی بھلائی ہر شخص کے پیش نظر ہونی چاہیے۔ نعمان بن

بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"تم مسلمانوں کو باہمی ہمدردی اور باہمی محبت اور باہمی شفقت میں ایسا دیکھو گے جیسے (جاندار) بدن ہوتا ہے، کہ جب اس کے ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو تمام بدن بدخوابی اور بیماری میں اس کا شریک بن جاتا ہے"۔

لیکن افسوس ہے کہ ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں خوش ہوتے ہیں اور ایذا رسانی کو بھی ایک ہنر سمجھتے ہیں۔

مسلمان کی شان کے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یہ بھی ہے کہ "مومن، الفت کا محل اور خانہ ہے اور اس شخص میں خیر نہیں جو کسی سے نہ خود الفت رکھے اور نہ اس سے کوئی الفت رکھے"۔

اسی مسلمان کی شان کو سورۃ الحجرات (آیت ۷) میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ

"خدا نے ایمان کو تمھارا محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمھارے نزدیک مکروہ بنایا"۔

ظاہر ہے کہ یہ دولت ایمان کی ہی تھی جس نے حضرت بلالؓ، حضرت صہیب رومیؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر قریب اور حضورؐ کا محبوب بنادیا اور خاص قریشیوں یعنی ابوجہل اور ابولہب کو کس قدر مردود کر دیا سورہ۔آل عمران (آیت ۱۰۳) میں بھی اسی دولت اور نعمت کا اس طرح ذکر ہے۔

"(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور اس کے فضل وکرم سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے"۔

اگر مسلمان آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں تو وہ ایسی قوت بن سکتے ہیں کہ

کوئی دشمن انھیں نظر اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا اور اس میں کسی ایذا رسانی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے اسی محبت پر زور دیا ہے اور وہ مسلمانوں کو "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کی طرح مضبوط دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الصف (آیت ۴) میں ارشاد فرمایا ہے

دراصل ہمارے باہمی جھگڑے عفو و درگذر کے نہ ہونے سے ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ دن بھر ہم اللہ پاک کی کیا کیا نافرمانیاں کرتے ہیں، لیکن وہ ہم کو معاف کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ ہماری ہر روز گرفت فرمائے تو ہمارا جینا مشکل ہو جائے۔ تو جب ہمارا اللہ اس قدر عفو و درگذر والا ہے تو ہمارے دلوں میں بھی یہی جذبہ ہونا چاہیے اور یہ جذبہ ایسا عجیب اور ایسا مفید ہے کہ بڑے سے بڑے اختلافات ذرا دیر میں ختم ہو سکتے ہیں اور آسانی کے ساتھ آپس میں صلح صفائی ہو سکتی ہے۔

سورۃ آل عمران (آیت ۱۳۲) میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اور اپنے پروردگار کی بخشایش اور اس کی جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت (اتنی بڑی ہے) جیسے زمین و آسمان، وہ ان پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے جو خوش حالی اور تنگ دستی میں (بھی خدا کی راہ پر) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرتے ہیں۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

اس آیتِ مبارکہ میں بھی درگذر کرنے والوں اور صلح صفائی رکھنے والوں کے لیے اللہ پاک کی بخشایش اور اجر عظیم کی بشارت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھی جائے کہ ایسے درگذر کرنے والے اور صلح صفائی رکھنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو قوت اور قدرت رکھتے ہوئے درگذر کرتے ہیں۔ ورنہ بزدل اور کمزور شخص اگر درگذر کرتا ہے اور مجبور ہو کر صلح صفائی کرتا ہے تو یہ اس کی کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی ہے۔ سورۃ الشوریٰ (آیت ۴۳) میں ارشاد ہے کہ:

"اور البتہ جو شخص صبر کرے اور دوسرے کی خطا بخش دے تو

بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں"۔

مولانا حالی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و درگزر کے سلسلے میں کہا ہے:

خطا کار سے درگذر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

جرأت و ہمت

قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ استعمال نہیں ہوئے ہیں لیکن ان دونوں کا نعم البدل ایک لفظ صبر ہے جس کے کئی معنی آتے ہیں۔لغوی معنی صبر کے ہیں " سختی اور تکلیف میں خود کو روکے رکھنا "۔اور شریعت کی اصطلاح میں صبر کہتے ہیں " نفس کو جمائے رکھنا ان امور کے لیے کہ جن کے لیے شریعت اور عقل حکم دیتی ہے اور ان امور سے باز رکھنا جن کو شریعت اور عقل منع کرتی ہے "۔پھر صبر کے جو کئی معنی ہیں تو ایک تو یہ ہے کہ مصیبت کو برداشت کرنا صبر ہے۔سخت مصیبت کو کشادہ دلی اور اطمینان قلب کے ساتھ برداشت کرنا بھی ایک قسم کا صبر ہے جسے رحب الصدر کہتے ہیں۔جنگ کے موقع پر شجاعت کو بھی صبر کہتے ہیں۔بات کو چھپانے یعنی راز داری کو بھی صبر کہتے ہیں۔بلکہ جرأت بے جا کو بھی صبر کہتے ہیں۔جیسا کہ سورۃ البقرہ (آیت ۱۷۵) میں کافروں کے متعلق کہ:

فمااصبر هم على النار

(یعنی وہ کافر، دوزخ پر کیسے صبر کرنے والے ہیں)

یعنی دوزخ میں داخل ہونے پر کیسی جرأت بے جا کر رہے ہیں۔حدیث میں روزہ کو بھی صبر کہا گیا ہے۔ارشاد ہے:

صیام شهر الصبر (صبر کے مہینے کے روزے)

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں مختلف مواقع پر مسلمانوں کی ہر قسم کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا علاج صبر اور تقویٰ بتایا گیا ہے۔مثلاً سورہ آل عمران (آیت

۱۲۰) میں ارشاد ہے کہ:

"اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو تم کو منافقین کی چالیں اور دشمنیاں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی"۔

یعنی صبر اور تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسی راہیں کھول دیتا ہے کہ منافقین کی تمام عیاریاں ختم ہو جاتی ہیں اور ان سے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ سورہ یوسف (آیت ۹۰) میں بھی اسی طرح کی تسلی ملتی ہے کہ

"بے شک جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ (ایسی) نیکی کرنے والوں کا حق ضائع نہیں کرتا"۔

ایک موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پاک کی ایسی آیت ہے کہ اگر لوگ اس پر عمل کریں تو ان کے لیے دین و دنیا میں وہی کافی ہے۔ وہ آیت (۲-۳) سورہ الطلاق کی ہے کہ

"جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کا راستہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا"۔

یعنی اس آیت کریمہ سے آخرت کی نجات اور دنیا کے رزق دونوں کے لیے ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں صبر اور استقامت کا ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک موقع پر جب دشمن سے مقابلہ تھا تو آپؐ نے کچھ انتظار فرمایا، یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا۔ پھر آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ "تم لوگ دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کی تمنا مت کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو اور جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہے"۔

اس حدیث سے دو خاص باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دشمن سے

مقابلہ میں پہل نہ کرو بلکہ اللہ تعالی سے عافیت مانگتے رہو، لیکن جب مقابلہ ہو جائے یعنی دشمن ہی پہل کرے تو پھر ڈٹ کر مقابلہ کرو اور یہ سمجھو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ یعنی ڈٹ کر مقابلہ کرنے ہی سے جنت کے حق دار بن سکو گے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا ہے کہ "مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کا ہر کام، خیر ہی خیر ہے اور یہ سعادت مومن کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں۔ وہ یہ ہے کہ اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا کوئی صدمہ ہوتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی خوشی اور فراخی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے"۔ یعنی وہ ہر حال میں خیر ہی خیر حاصل کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان خیر ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور ایمان کی بدولت اسے بے شمار دینی اور دنیوی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ان نعمتوں پر غور کیا جائے تو مسلمان کا رواں رواں بھی زبان بن کر شکر ادا نہیں کر سکتا۔ یہاں ان نعمتوں میں سے صرف دو کا ذکر کرنا فائدے سے خالی نہ ہو گا۔ وہ دو خاص نعمتیں یہ ہیں کہ ایمان کی بدولت انسان اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ وہ دس کافروں پر بھی غالب ہو جاتا ہے۔ سورۃ الانفال (آیت ۶۵) میں ہے کہ

> "اے نبیؐ! مسلمانوں کو تم جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں بیس (۲۰) صبر (استقامت) والے ہوں گے تو وہ دو سو (۲۰۰) پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سو ہوں گے تو وہ کافروں کے ایک ہزار پر غالب ہوں گے، اس لیے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے"۔

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کی بدولت ایک مسلمان دس کافروں پر بھاری ہے اور یہ کہ کفار ایمان نہ ہونے کی وجہ سے سمجھ بھی اس مسلمان کے برابر نہیں رکھتے۔ گویا مسلمان کو اس کی ایمانی قوت کی بدولت غلبے کی بشارت دی گئی ہے۔ دوسری ایک اور خصوصی نعمت یہ ہے کہ وہ پاک اور پاکیزہ ہوتا ہے، کیوں کہ

سورۃ التوبہ (آیت ۲۸) میں کافروں کو محض ناپاک کہا گیا ہے کہ " اے ایمان والو! مشرک محض ناپاک ہیں"۔

یعنی ان کا ظاہر اور باطن (دونوں) خباثتوں سے بھرا ہوا ہے۔ گویا ان کے مقابلے میں ایک مسلمان اپنے ایمان کی وجہ سے ظاہر اور باطن دونوں میں پاک اور مطہر ہوتا ہے اور تمام خباثتوں سے پاک ہوتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کے نیک امتیوں کے ایمان کی قوت کا بھی سورہ۔آل عمران (آیت ۱۴۶) میں ذکر ہے کہ

" اور کتنے ہی انبیاء نے جہاد کیا، ان کے ساتھ بہت سے اللہ والے تھے، تو وہ لوگ نہ سست پڑے اور مصیبتوں سے جو اللہ کی راہ میں انھیں پہنچیں اور نہ وہ کمزور ہوئے اور نہ دبے۔ اور صبر والے لوگ اللہ کو محبوب ہیں"۔

اسی سورہ۔آل عمران (آیت ۱۳۹-۱۴۱) میں یہ بھی ارشاد ہے کہ:

" اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ۔ اور تم ہی غالب آؤ گے، اگر ایمان رکھتے ہو۔ اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچی تو وہ (کفار) بھی ویسی ہی تکلیف پا چکے ہیں اور یہ دن ہیں جن میں ہم نے لوگوں کے لیے باریاں رکھی ہیں اور اس لیے اللہ تعالیٰ پہچان کرا دے ایمان والوں کی (کہ وہ کس قدر ثابت قدم ہیں) اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا مرتبہ دے۔ اور اللہ دوست نہیں رکھتا ظالموں (یعنی بدکاروں) کو۔ اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نکھار کر دے اور کافروں کو مٹا دے"۔

سورہ۔آل عمران (آیت ۲۰۰) میں پھر ہمت اور جرأت والوں کے لیے ارشاد ہے

" اے ایمان والو، صبر اور حوصلہ رکھو اور حوصلے سے دشمنوں

کے آگے رہو اور (سرحد پر) نگہبانی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ کامیاب ہو جاؤ"۔

اس آیتِ مبارکہ میں صبر و استقامت، حوصلہ اور ثابت قدمی کی پھر ہدایت ہے کہ اس ہدایت پر عمل کرنے ہی سے کامیابی ہو سکتی ہے اور ہر طرح کا غلبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ سورہ محمد (آیت ۳۵) میں اللہ تعالیٰ نے پھر تسلی دی ہے کہ

"تم سستی نہ کرو اور خود ان (کافروں) کو صلح کی طرف نہ بلاؤ اور تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمھارے اعمال میں تمھیں نقصان نہ دے گا"۔

قرآن پاک جگہ جگہ ایمان والوں کو ان کے ایمان کی وجہ سے دنیا میں تسلی، ہمت، حوصلہ اور آخرت میں بہت بڑے اجر کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ سورۃ الفتح (آیت ۱۔۵) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے حضورؐ کے طفیل میں جس طرح بشارتیں بیان فرمائی گئی ہیں وہ یہ ہیں

"بے شک ہم نے تمھارے لیے روشن فتح فرما دی، تاکہ اللہ تعالیٰ تمھاری وجہ سے گناہ بخش دے تمھارے اگلوں کے اور تمھارے پچھلوں کے اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دے اور تمھیں سیدھی راہ دکھا دے اور اللہ تعالیٰ تمھاری زبردست مدد فرمائے۔ وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں اطمینان اتارا، تاکہ انھیں ایمان پر ایمان بڑھے اور اللہ ہی کی ملک ہیں تمام لشکر آسمانوں کے اور زمین کے اور اللہ علم و حکمت والا ہے تاکہ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں میں لے جائے، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں اور اللہ ان سے ان کی برائیاں دور کر دے اور یہ چیز اللہ کے یہاں بہت بڑی کامیابی ہے"۔

پھر سورۃ الزمر (آیت ۳۶) میں ایسی زبردست تسلی دی جسے مسلمان اپنے لیے ہر موقع پر حرزِ جان بنا سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

الیس اللہ بکاف عبدہٗ

(یعنی کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟)

سبحان، کتنی زبردست تسکین ہے! اللہ پاک اس تسکین کے حصول کی ہم سب کو سعادت عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

فتنہ و فساد

قرآن پاک میں انسانوں کی دو جماعتوں کا ذکر ہے۔ ایک تو حزب اللہ (یعنی اللہ کی جماعت) ہے اور دوسری حزب الشیطان (یعنی شیطانی جماعت) ہے۔ ظاہر ہے کہ جو جماعت، اللہ کی ہو گی وہ اللہ کے احکام پر عمل کرے گی، اللہ کے لیے اس کے دل میں محبت ہو گی، اللہ کے لیے اس کو بغض ہو گا اور اس کا جینا مرنا سب اللہ کے لیے ہو گا۔ سورۃ المجادلہ (آیت ۲۲) میں اللہ کی جماعت کے متعلق ارشاد ہے:

"جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں ان کو آپ ایسا نہیں پائیں گے کہ وہ محبت کریں، ان سے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں، ان کے بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے رشتے دار۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی روح سے ان کی تائید فرمائی ہے۔ وہ ان کو باغوں میں داخل فرمائے گا، جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ لوگ اس سے راضی۔ یہ اللہ کی جماعت ہے۔ یاد رکھو، اللہ کی جماعت والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔"

اللہ کی جماعت والوں کی شان کا ذکر سورۃ الانعام (آیت ۱۶۳) میں اس طرح آتا ہے کہ

"آپؐ فرما دیں کہ بے شک میری نماز، میری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا، اللہ ہی کے لیے ہے، جو سارے جہانوں کا رب ہے"۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اللہ کی جماعت صرف اللہ کے لیے جیتی اور مرتی ہے،

اپنے ہوا و ہوس، خود پسندی، نفس پرستی، تنگ نظری کے لیے نہ وہ جینا پسند کرتی ہے اور نہ مرنا چاہتی ہے۔ لیکن شیطانی جماعت صرف ایسے ہی رذائل اختیار کرتی ہے اور اللہ کے واضح احکام سے روگردانی کرتی ہے۔ سورۃ المجادلہ (آیت ۱۹) میں ایسی جماعت کے متعلق ارشاد ہے کہ:

"شیطان نے ان پر قابو پالیا ہے۔ پس اس نے ان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہ شیطان کی جماعت ہے۔ یاد رکھو، شیطان کی جماعت ہی نقصان اٹھانے والی ہے"۔

یعنی یہی وہ جماعت ہے جس میں کافر، مشرک اور منافق ہوا کرتے ہیں۔

سورۃ البقرہ (آیت ۹-۱۲) میں ایسے منافقوں کا ذکر ہے کہ

"وہ لوگ اللہ اور اس پر ایمان والوں کو فریب دینا چاہتے ہیں اور حقیقت میں وہ فریب نہیں دیتے مگر (خود) اپنی جانوں کو (فریب دیتے ہیں) اور انھیں شعور نہیں۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا۔ اور جو ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرتے ہیں۔ یاد رکھو، وہی لوگ فسادی ہیں مگر ان کو شعور نہیں۔"

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ فساد پھیلاتے ہیں اور تفرقہ بازی کرتے ہیں وہ اللہ اور ایمان والوں کو فریب دینا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ اور اس کے پیارے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام تو ایمان اور اسلام ہی کی تبلیغ فرماتے ہیں جو سراسر امن و سلامتی، اتفاق اور اتحاد ہے۔ اللہ پاک نے تضرع اور عاجزی کے ساتھ خیر کے طلب کرنے کا جو طریقہ ارشاد فرمایا ہے وہ اسی اصلاح اور سلامتی کے لیے ہے۔ سورۃ الاعراف (آیت ۵۵-۵۶) میں ارشاد ہے کہ

"اپنے رب سے دعا کرو گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ بھی ۔ بے
شک حد سے بڑھنے والے لوگ اسے پسند نہیں ۔ اور زمین میں فساد نہ
پھیلاؤ ۔ اس کی اصلاح کے بعد ۔ اور اس سے دعا کرو ڈرتے ہوئے اور
طمع کرتے ہوئے ۔ بے شک اللہ کی رحمت، نیکوں سے قریب ہے"۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ جو لوگ امن چاہتے ہیں اور فساد سے دور رہتے ہیں وہ اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہیں اور عاجزی کے ساتھ دعا کرتے ہیں ۔

مسلمانوں کے آپس کے تعلقات کے لیے سورۃ الحجرات (آیت ۱۰) میں ارشاد ہے کہ:

بے شک مسلمان مسلمان بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں
میں صلح کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو"۔

اس آیت مبارکہ سے ظاہر ہے کہ اللہ سے رشتہ رکھنے والے لوگ ہی آپس میں بھائی بھائی ہیں اور وہ آپس میں صلح کراتے ہیں اور فتنہ و فساد سے دور رہتے ہیں ۔ یعنی جو لوگ آپس میں پھوٹ ڈلواتے ہیں وہ نہ تو اللہ سے ڈرتے ہیں اور نہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں ۔

مسلمانوں کی اعلیٰ شان کے متعلق سورۃ آل عمران (آیت ۱۱۰) میں ارشاد ہوتا ہے کہ " تم (دنیا میں) بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے لایا گیا ہے، تاکہ تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور اللہ پر ایمان رکھو"۔

یعنی اللہ پر ایمان رکھنے والا شخص ہمیشہ فضائل کی طرف نظر رکھے گا اور رذائل سے دور رہے گا اور دوسروں کو بھی نیکی کے لیے حکم دے گا اور برائی سے دور رکھے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح مسلمانوں میں کبھی دین کے نام پر انتشار نہیں ہوتا ۔ ان میں تفسیر، تعبیر اور تدبیر وغیرہ میں بے شک اختلاف ہوتا ہے، بلکہ چاروں اماموں میں بھی مسلک کے لحاظ سے اختلاف ہوا ہے، لیکن آپس میں ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ احترام و اکرام رہا ہے اور گروہ بندی کو انھوں نے کسی طرح روا نہیں رکھا ۔ وہ امت

کے تعلقات کو جوڑتے تھے، توڑتے نہیں تھے اور نہ اپنی جماعت کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔

سورہ۔ آل عمران (آیت ۱۰۵۔۱۰۶) میں اس تفرقہ بازی کے متعلق وعید آتی ہے کہ

"اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح احکام ملنے کے باوجود فرقوں میں بٹ گئے اور آپس میں انتشار پیدا کر لیا اور جو لوگ یہ تفرقہ بازی کریں گے ان کو عذابِ عظیم ہوگا۔ اس دن کچھ لوگوں کے چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ لوگوں کے منہ کالے ہوں گے۔ پس جن لوگوں کے منہ کالے ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کافرانہ فعل اختیار کیا تھا۔ پس تم اس کفرانِ نعمت کے سبب عذاب چکھو"۔

یہ کافرانہ فعل، سورۃ الروم (آیت ۳۱۔۳۲) میں بھی مذموم فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

"اللہ کی طرف رجوع کرو، اس سے ڈرو، نماز کی پابندی کرو اور تم مشرکوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے دین میں تفرقہ ڈالا اور پارٹیوں میں بٹ گئے اور ہر جماعت اپنے طریقے پر خوش ہو رہی ہے"۔

فرقہ بازی اور گروہ بندی دراصل عذابِ الہیٰ ہے، جیسا کہ سورۃ الانعام (آیت ۶۵) میں فرمایا گیا ہے کہ

"اللہ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب اوپر سے (یعنی آسمان سے) اور زمین میں سے بھیجے، یا تم کو پارٹیوں میں بانٹ دے اور ایک دوسرے سے لڑادے"۔

غرض کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا حریف نہیں بلکہ حقیقی بھائی ہے اور بدن کے اعضا کی طرح ہے، جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"تم مسلمانوں کو باہمی ہمدردی اور باہمی محبت اور باہمی شفقت میں ایسا دیکھو گے جیسے بدن ہوتا ہے کہ جب اس کے ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو تمام بدن، بدخوابی اور بیماری میں اس کا ساتھ دیتا ہے"۔(بخاری و مسلم)

لیکن اسلام سے دوری کی وجہ سے باہمی محبت اور اخلاص کے بجائے ہم میں ایسے رذائل عام ہیں کہ ان سے معاشرے میں فتنہ و فساد پھیلتا ہے اور بغض و عناد کی پرورش ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر پھبتی کسنا، مذاق اڑانا، طعن و تشنیع کرنا، عیب جوئی کرنا، شیخی بگھارنا، غرور و تکبر کرنا، بدگمانی کرنا، حسد کرنا، کسی فرد یا جماعت کے حالات کو کریدنا، غیبت کرنا، بہتان باندھنا، چغلی کرنا، چاپلوسی کرنا، کسی کی حق تلفی کرنا، فروعی اختلافات کو اچھالنا، دورخی اور منافقت کو اپنانا، غلط طریقے سے نفع خوری کرنا، ناقص مال کو اچھا کہہ کر بیچنا، سچ بات کو چھپا کر شہادت نہ دینا اور کمزور کی مدد نہ کرنا، وغیرہ کتنے کبیرہ گناہ ہیں جن کے ہم عادی ہیں اور جن کے ہم ہمیشہ مرتکب ہیں اور پھر بھی خود کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ کیا ان رذائل کی وجہ سے فرد اور جماعت دونوں کو فتنہ و فساد کا شکار نہیں ہونا پڑتا اور کیا یہ ایک مسلمان کو زیب دیتے ہیں؟

آخر میں ہم پھر اللہ پاک کے اس ارشاد کی طرف رجوع ہوتے ہیں جس میں حکم ہے کہ

"اور چھوڑ دو گناہ اور چھپے گناہ۔ بے شک جو لوگ (ایسے) گناہ کرتے ہیں عنقریب ان کو سزا دی جائے گی اس پر جو ان کے کرتوت ہیں"۔(سورہ۔ انعام، آیت ۱۲۱)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

شکرِ نعمت

اس موضوع میں دو لفظ ہیں یعنی (۱) شکر اور (۲) نعمت ۔ شکر کے معنی ہیں احسان ماننا، قدر پہچاننا یا اپنے منعم کے ذکر سے اوقات کا پر ہو جانا ۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی رقم طراز ہیں کہ "شکر پانچ قاعدوں پر مبنی ہے ؛ (۱) شاکر کی مشکور کے لیے فروتنی، (۲) اس سے محبت کرنا، (۳) اس کی نعمت کا معترف ہونا، (۴) اس نعمت کی بنا پر اس کی ثنا کرنا اور (۵) اس نعمت کو ایسی جگہ استعمال نہ کرنا جہاں وہ منعم پسند نہ کرے ۔ ان پانچ باتوں پر شکر کی اساس ہے اور ان میں سے ہر ایک کا پایا جانا ضروری ہے ۔ پھر شکر تین طرح کا ہوتا ہے ؛ (۱) شکر قلبی یعنی دل سے شکر ادا کرنا، (۲) شکر لسانی یعنی زبان سے شکر کا اظہار کرنا اور (۳) شکر جمیع اعضاء یعنی بدن کے تمام اعضا کا اپنے محسن کے احسان کو یاد کرنا ۔

اسی طرح نعمت جس کے معنی ہر وہ چیز ہے کہ جو کسی کو دی جائے کئی مرادی معانی میں مستعمل ہے ۔ مثلاً سورۃ البقرہ (آیت ۲۱۱) میں آیات الٰہیہ کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے ۔ سورۃ المائدہ (آیت ۶) میں ایمان و اسلام کے معنی میں ہے ۔ سورۃ آل عمران (آیت ۱۷۱) میں ثواب کے لیے ہے ۔ اسی سورت (کی آیت ۱۷۴) میں سلامتی کے لیے بھی ہے ۔ سورۃ المائدہ (آیت ۲۰) میں نبوت اور بادشاہت کے سلسلے کے لیے بھی مستعمل ہے ۔ سورہ ابراہیم (آیت ۶) میں بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات دینے کے معنی میں آیا ہے ۔ سورۃ العنکبوت (آیت ۶۷) میں مکہ معظمہ کو مقام امن بنا دینے کے معنی میں ہے ۔ سورہ فاطر (آیت ۳) میں حرم کے اندر سکونت کرا دینے کے لیے ہے ۔ سورہ

لقمان (آیت ۳۱) میں سمندر کے اندر جہازوں کے چلانے کے سلسلے میں ہے۔ سورۃ الاحزاب (آیت ۹) میں مسلمانوں کو شکست سے بچالینے کے سلسلے میں ہے۔ اسی طرح دوسری سورتوں میں اس لفظ کے مختلف مرادی معانی آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ نعمت (نون پر زبر) بھی سہولت، عیش اندوزی، آسائش وغیرہ معانی میں مستعمل ہے۔ جیسے سورۃ المزمل (آیت ۱۱) میں یہ لفظ آیا ہے کہ

"اور مجھ پر چھوڑ دو ان جھٹلانے والے عیش اندوزوں کو اور انھیں تھوڑی مہلت دو"۔

بہرحال نعمت، انعام سے مشتق ہے، اس لیے عنایت، مہربانی اور خوشی وغیرہ مختلف مرادی معنوں میں مستعمل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو اچھے اخلاق تعلیم فرمائے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے انعامات اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔

سورۃ البقرہ (آیت ۱۵۲) میں ارشاد ہے:

"پس تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر کرنا بھی بہت بڑی فضیلت ہے۔ سورہ ابراہیم (آیت ۷) میں ارشاد ہے کہ:

"اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں ضرور اور زیادہ دوں گا"۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے شکر گذار بندے سے خوش ہوتا ہے اور اس کے لیے نعمتوں میں اضافہ فرما دیتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم طاعت بجالا کر مجھے یاد کرو، میں تمھیں اپنی امداد کے ساتھ یاد کروں گا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو اپنے شکر گذار بندے کو یاد فرماتا ہے، تو اس یاد میں اس کی امداد شامل حال ہوتی ہے، جو

ظاہر ہے کہ انعام در انعام ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر بندہ مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو بھی اسی طرح یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اس سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں"۔ اللہ تعالیٰ کی یاد بھی اس کی نعمت کا ایک شکرانہ ہے کہ بندہ اس یاد سے اپنے پروردگار کی شان کو اپنے دل کا نقش بناتا ہے اور اس یاد سے راحت حاصل کرتا ہے۔ سورۃ الرعد (آیت ۲۸) میں صاف طور پر ارشاد ہے کہ "یاد رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے"۔

یہ یاد تمام یادوں سے افضل ہے، کیوں کہ یہ سب سے اعلیٰ ذات کی یاد ہے۔ تو جس طرح وہ سب سے اعلیٰ ہے اس کی یاد بھی سب سے اعلیٰ ہے اور اس کو یاد کرنا بھی بہت بڑی نعمت کا شکرانہ ہے۔ پھر مومن کے لیے ہر طرح فضل ہی فضل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

> "مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے تمام کاموں میں نیکی ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں اور وہ یہ ہے کہ جب کسی مومن کو خوشی حاصل ہوتی ہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور یہ اس کے لیے نیکی ہے اور اگر اس کو کوئی سختی اور مصیبت پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے نیکی ہے"۔

یہاں حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں آیا۔ اس کا ہاتھ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے ان سے دعا کی درخواست کی کہ اس کو شفا حاصل ہو جائے۔ آپ نے اس طرح دعا کی ہے: "اے اللہ، ہم جانتے ہیں کہ بلا بھی ایک نعمت ہے، مگر ہم لوگ اپنی کمزوری کی وجہ سے اس نعمت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ پس اے اللہ! اس بلا کی نعمت کو شفا کی نعمت سے بدل دے"۔ سبحان اللہ، کیسی اچھی دعا ہے۔

اس واقعے میں اس حدیث کی طرف بھی اشارہ ہے کہ "مسلمان کے لیے یہ عجیب بات ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ احتساب اور صبر کرتا ہے اور جب کوئی بھلائی حاصل ہوتی ہے تو اللہ کی حمد اور شکر کرتا ہے "۔ بے شک مسلمان کو ہر چیز سے اجر دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ جو لقمہ وہ کھاتا ہے اس پر بھی اجر دیا جاتا ہے "۔ یعنی صبر بھی ایک نعمت ہے اور شکر بھی نعمت ہے، گویا خیر ہو یا شر، جب مسلمان کا واسطہ ان دونوں چیزوں سے پڑتا ہے تو وہ اپنے لیے دونوں کو موجبِ خیر بنا لیتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جس چیز کو ہم شر سمجھتے ہیں یا سمجھ لیتے ہیں وہ خیر ہی ہوتی ہے ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو رحیم و کریم ہی ہے، اس لیے جو کچھ اس کی طرف سے ملتا ہے وہ خیر ہی خیر ہے۔

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

اللہ تعالیٰ جیسا کوئی خیر خواہ نہیں ہو سکتا اس لیے شر بھی خیر یا موجبِ خیر بن جاتا ہے ۔ یہ تصور ایک مسلمان کا ہوتا ہے اسی لیے ہر زمانے میں مسلمانوں نے مصیبتوں کو بھی خوش ہو کر برداشت کیا، بلکہ ان مصیبتوں کو مصیبت ہی نہیں سمجھا۔ یہ مصیبتیں ایک مسلمان کے گناہوں کا کفارہ بھی بن جاتی ہیں اور ان سے اس کے نفس کی بھی بڑی اصلاح ہوتی ہے۔

واقعی اگر انسان غور کرے تو اسے آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں نازل ہوتی ہیں ۔ وہ نیست سے ہست کیا گیا، اس کی پرورش کے لیے ماں باپ کے دل میں محبت پیدا کرائی گئی، اس کی تربیت کے لیے والدین اور استادوں کی شفقتوں کو بیدار کیا گیا، اس کی ضرورتوں کے لیے کتنے ہمدردوں کو آمادہ کیا گیا، اعزہ، پڑوسی، محلہ والے، شہر والے اور بنی نوع انسان کے دلوں میں خلوص کے جذبات پیدا کیے گئے اور اس کی زندگی کے پورے نظام کو ہر طرح درست کرایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ سورۃ النحل (آیت ۱۶) میں فرمایا گیا

ہے کہ "اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرو تو شمار نہ کر سکو گے "۔جب نعمتوں ہی کا شمار ہمارے بس کی بات نہیں، تو پھر کس طرح اور کس کس نعمت کا شکر ادا ہو سکے گا؟ حضرت سعدیؒ نے گلستان کے شروع میں اسی لیے لکھا ہے کہ "انسان جو سانس اندر کی طرف لے جاتا ہے وہ زندگی کو بڑھانے والی ہوتی ہے اور جو سانس وہ باہر نکالتا ہے وہ فرحت بخشنے والی ہوتی ہے، پس ہر سانس پر دو شکر واجب ہوئے "۔ کیا واقعی ہم اس طرح ہر سانس پر دو شکر ادا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں؟

بخل ایمان کی کمزوری ہے

انسان ضرورتوں کا مجموعہ ہے۔ صبح سے شام تک اسے بہت سی حاجتیں درپیش آتی ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، رہنے سہنے میں بلکہ پوری زندگی اور پورے معاشرے میں اسے کیا کیا چیزیں درکار نہیں ہوتیں! انھی چیزوں کو حد اعتدال پر قائم رکھنے سے زندگی بنتی اور سنورتی ہے، ورنہ اس کی زندگی اس کے لیے عذاب جان بن جاتی ہے۔ اگر اس کی آمدنی سے زیادہ اس کے اخراجات ہیں تو ظاہر ہے کہ آج نہیں تو کل اسے مختلف مصائب کا سامنا کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی آمدنی کے معقول ہونے کے باوجود اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال دے اور ہر وقت پیسہ بچانے کی فکر میں رہے تو ایسی صورت میں بھی وہ چین سے نہیں رہ سکتا۔ اللہ پاک نے سورۃ الھمزہ (آیت ۱۔۴) میں ایسے لوگوں کی اس طرح مذمت فرمائی ہے کہ

"جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنا کیا اس کو، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ہرگز یوں نہیں۔ وہ ضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا"۔

وجہ یہی ہے کہ مال کو اپنے مصرف میں نہ لانا اور اپنے عزیزوں اور مستحق لوگوں کے خرچ میں نہ لانا، خود مال کو بے قیمت بنانا ہے۔ آخر وہ مال کس کام کا جو صرف گاڑ کر رکھا جائے اور وہ کسی کے فائدے کے لیے نہ ہو۔ سورۃ التوبہ (آیت ۳۴۔۳۵) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی

راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو آپ دردناک سزا کی بشارت دیجیے
کہ اس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان
کی پیشانیوں، کروٹوں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) کہ
یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے گاڑ کر رکھا تھا، تو جسے تم گاڑ کر رکھا
کرتے تھے، اس کا مزہ چکھو"۔

اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ مال جوڑ جوڑ کر رکھنا کوئی مقصدِ زندگی نہیں، بلکہ وہ ضرورت مندوں کے لیے یعنی اپنے لیے اور دوسروں کے لیے استعمال کی چیز ہے سہجتاں چہ جہاں یہ استعمال رک جاتا ہے وہاں سبھی کے لیے پریشانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور آخرت میں جو عذاب ہو گا وہ ان معاشرتی مصائب کے علاوہ ہے۔ سورہ۔ آل عمران (آیت ۱۸۰) میں ارشاد ہے کہ

"اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنے فضل سے ان کو دیا
ہے روکے رکھتے ہیں، وہ اسے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان
کے حق میں شر ہے۔ جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں، اس کا طوق بنا کر
ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا"۔

بخیل کو جو مال و دولت سے محبت ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہ زکوٰۃ و خیرات کے ادا کرنے سے گریز کرتا ہے، ظاہر ہے کہ اسے خدا کا خوف اور آخرت کے عذاب کی پروا نہیں ہوتی۔ تو جب اس کا یہ حال اور اس کا یہ ایمان ہو تو اس میں وہ برائیاں سبھی پیدا ہو جاتی ہیں جن کا ذکر سورۃ الفجر (آیت ۱۷۔۲۰) میں آتا ہے کہ

"تم یتیم کی توقیر نہیں کرتے اور مسکین کے کھلانے کے لیے
ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے اور تم مردے کے متروکہ مال کو
کھا جاتے ہو اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو"۔

دنیا کو چاہنے والا اور خدا پر کامل ایمان نہ رکھنے والا ایسا ہی کرتا ہے۔ وہ یتیم کو

حقیر سمجھتا ہے، حالاں کہ خود حقیر ہے کہ اس نے ایک بے بس اور بے کس شخص یعنی یتیم پر رحم نہیں کھایا۔ایسا شخص خود مسکین ہے کہ اس نے ایک مسکین کو بھوکا رکھ کر اپنا مال بچانے کی کوشش کی اور ایسا شخص خود مردہ ہے کہ اس نے ایک مردے کے مال کو اپنے لیے زندگی کا ذریعہ بنایا۔ یعنی اللہ پاک کے فضل کے ناقدری کر کے اور اس کے احکام سے بے اعتنائی برت کر اپنے مال کو بچانے کی کوشش میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ کیا اور ممنوعہ مال کو اپنے پیٹ کے لیے آگ بنالیا ۔ سورۃ المعارج (آیت ۱۵۔۱۸) میں اس طرح کے لوگوں کے لیے ایسے عذاب کی وعید ہے کہ

"ہر گز نہیں، وہ تپتی ہوئی آگ ہے، کھینچ لینے والی کھال کو۔
وہ پکارے گی اس کو جس نے (حق سے) پیٹھ دی اور پھر گیا اور اکٹھا کیا
اور سینت سینت کر رکھا"۔

ان آیاتِ مبارکہ میں حق سے انحراف کرنے والے، دین سے پھر جانے اور سینت سینت کر مال کر رکھنے والے کو ایک ہی صف میں رکھا گیا ہے ۔ یعنی یہی لوگ اللہ کا خوف نہیں کرتے، (گو کہ بظاہر مسلمان ہیں) اور اللہ کے حکم کے مطابق اپنا مال خرچ نہیں کرتے، بلکہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ سورۃ الیل (آیت ۸۔۱۱) میں بھی ارشاد ہے کہ:

"اور وہ جس نے بخل کیا اور لاپروا بنا رہا اور سب سے اچھی
(ملت) کو جھٹلایا، تو بہت جلد ہم اسے دشواریوں میں ڈال دیں گے
اور اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا، جب وہ ہلاکت میں پڑے گا"۔

یعنی یہاں ان لوگوں کے لیے پھر وعید ہے، جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہیں کرتے اور بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ ان کی مدد نہیں کرتے ایسے لوگ دنیا اور آخرت میں بھی کبھی خوش نہیں رہ سکتے اور ان کا مال کہیں کام نہیں آئے گا۔ یہ آیتیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور امیہ بن خلف کے حق میں

نازل ہوئی تھیں۔ حضرت بلالؓ، امیہ کے غلام تھے۔ ان کو وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے بہت تکلیفیں دیتا تھا۔ ایک دن اس نے حضرت بلالؓ کو گرم ریت پر ڈال کر ان کے سینے پر تپتے ہوئے پتھر رکھے، لیکن آپؓ ایسی تکلیف میں بھی کلمۂ احد پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے روکنا چاہا تو اس نے کہا کہ آپ کو ان کی تکلیف ناگوار ہے تو آپ انھیں خرید لیجیے۔ چناں چہ آپؓ نے بہتر گراں قیمت ادا کر کے انھیں آمادہ کرایا۔ پھر امیہ جس طرح تباہ ہوا وہ مورخین سے پوشیدہ نہیں۔ بہر حال ان آیات سے کئی سبق حاصل ہوتے ہیں کہ بخل کی وجہ سے بخیل سمجھتا ہے کہ میں نے اپنا مال بچالیا، تو ظاہر ہے کہ ایسا مال کتنے دن کام آئے گا۔ پھر وہ اللہ کے احکام کی نافرمانی کر کے اسی کے دیے ہوئے مال کو اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتا، تو یقیناً وہ اس کی ناراضی اور خفگی مول لیتا ہے اور اللہ کی ناراضی کا مول لینا دونوں جہانوں میں اس کی تباہی اور بربادی کا موجب بن جاتا ہے۔ سورہ محمدؐ (آیت ۳۷-۳۸) میں ایسے بخیلوں کے لیے پھر وعید ہے کہ ان کو تباہ کر کے ان کی جگہ ان سے بہتر لوگوں کو متعین و مسلط کر دیا جائے گا۔ ارشاد ہے کہ

"ہاں، یہ جو تم بلائے جاتے ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، تو تم میں سے کوئی بخل کرتا ہے اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنی جان پر بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم سب فقیر ہو۔ اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمھارے سوا دوسرے لوگ بدل لے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

یعنی احکام الہیٰ کے مطابق خرچ نہ کرنا بہت بڑے عذاب کو دعوت دینا ہے کہ دینی اور دنیوی تباہی کے علاوہ بخیل کی جگہ بہتر لوگ بھی متعین کر دیے جاتے ہیں، جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پہچانتے ہیں اور مال کا صحیح مصرف کر کے مخلوق کی پریشانیوں کو دور کرتے ہیں۔ سورہ مدثر (آیت ۴۲-۴۶) میں دوزخیوں کے سوال و

جواب کا ایک مکالمہ ہے کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم لوگ دوزخ میں کیوں ڈالے گئے تو وہ یہی کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور اللہ کے اس قدر نافرمان تھے کہ دین کے مخالفوں کے ساتھ مل کر دین پر اعتراض کرتے تھے۔ ارشاد اس طرح ہے:

"تم کو دوزخ میں کون سی چیز لے گئی؟ وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور (دین پر) بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے"۔

گویا مسکین اور یتیم پر مال خرچ نہ کرنا بھی دوزخ تک پہنچانے کا موجب بن جاتا ہے اور اس سے زیادہ ایمان کی کیا کمزوری ہو سکتی ہے کہ احکام الٰہی کی پروا نہ کرتے ہوئے خزانہ کا سانپ بن کر ایسے مال کی حفاظت کی جائے جو فانی بھی ہو اور ہاتھ کا میل بھی ہو۔ نہ قارون کو اس کا خزانہ زندہ رکھ سکتا ہے اور نہ ابولہب کو اس کی دولت کوئی نفع پہنچا سکتی ہے۔ سورۃ الکہف (آیت ۴۶) میں مال اور اولاد کو صرف اس دنیا کی زینت کہا ہے کہ

"مال اور اولاد اس دنیا کی زندگی کا سنگار ہیں اور باقیاتِ صالحات (یعنی باقی رہنے والے اعمال خیر) کا ثواب تمہارے رب کے یہاں بہتر ہو گا اور وہیں سب سے بہتر امید (پوری) ہو گی"۔

کاش ان باقیاتِ صالحات ہی سے ہماری قوم مستفیض ہو سکے!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

عدل اور احسان

اس موضوع میں دو لفظ ہیں؛ (۱) عدل اور (۲) احسان ۔ عدل، داد اور انصاف کو کہتے ہیں ۔ یعنی برابر برابر تقسیم کرنا اور ہر شخص کو وہ جزا اور وہ سزا دینا جس کا وہ مستحق ہے اور جو اس کے کردار کے لائق ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ظلم اور رحمت کی درمیانی حالت کا نام عدل ہے ۔ امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ "عَدلؔ اور عِدلؔ دونوں کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں اور ان دونوں میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں ۔ لیکن عدل کا لفظ معنوی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے احکام شرعیہ ----- اور عِدلؔ یا عَدِیلؔ کے الفاظ ظاہری چیزوں کے لیے بولے جاتے ہیں، یعنی ایسی چیزیں جن کا تعلق ناپ تول سے ہوتا ہے ۔ پھر عدل میں دو پہلو ہیں؛

ایک عَدل مطلق ہے، جیسے کسی کے احسان کے بدلے میں احسان کرنا اور جو شخص تمھیں تکلیف نہ دے اسے ایذا نہ پہنچانا ۔

دوسرا عدل شرعی ہے، جیسے قصاص اور جنایات کی دِیت وغیرہ" ۔

بعض فقہاء نے اس طرح بھی لکھا ہے کہ "کسی شخص نے تمھارا ایک روپیہ ناجائز طریقے سے دبالیا ۔ تم نے بجائے ایک روپے کے اس سے دو روپے وصول کر لیے، تو یہ ظلم ہوا، کیوں کہ سزا، عمل سے بڑھ گئی اور اگر سزا پر قدرت رکھنے کے باوجود، قصداً تم نے درگذر کرتے ہوئے وہ روپیہ اسے معاف کر دیا تو یہ مغفرت اور بخشش ہے ۔ لیکن اگر تم نے اپنا واجب حق یعنی ایک روپیہ، بغیر کمی بیشی کے وصول کر لیا تو یہ عدل ہوا ۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے تمھارے لیے ایک نیکی کی اور تم نے اس کے لیے کسی نوع کی ایک سے زائد نیکیاں کیں تو یہ احسان ہے۔ لیکن اگر تم اس کے ساتھ برائی سے پیش آئے تو یہ ظلم ہے۔ ہاں اگر ٹھیک اسی طرح کی نیکی اس کے ساتھ تم نے بھی کی، جیسی کہ اس نے تمھارے ساتھ کی تھی تو یہ عدل ہوا۔ لیکن واضح رہے کہ پہلی صورت میں عدل کی بہ نسبت مغفرت اور بخشش پر کاربند ہونا اور دوسری صورت میں عدل کی نسبت احسان پر کاربند ہونا اولیٰ ہے"۔

بہرحال، عدل کا اختیار کرنا واجب ہے اور احسان مستحب ہے۔ اور ان دونوں کے لیے سورۃ النحل (آیت ۹۰) میں حکم ہے کہ **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان** یعنی، اللہ تعالیٰ بے شک عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے)۔

بھلائی اور نیکی کرنے کے علاوہ ایک اور معنیٰ احسان کے یہ بھی ہیں، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے، کہ بندہ، خدا کی اس طرح فرماں برداری کرے کہ گویا خدا اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، کیوں کہ اگرچہ وہ خدا کو اپنی آنکوں سے نہیں دیکھ پاتا، لیکن خدا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ احسان کی یہ صورت، اوپر کی دونوں صورتوں کو شامل ہے اور عبادات، اذکار اور تمام اعمال خیر اسی کے ذیل میں آجاتے ہیں۔

بہرحال عدل شرعی طور پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ان کی حد کے اندر رہنے دینا، یعنی احکام الٰہیٰ کو ان کے مقام سے ذرہ برابر گھٹایا بڑھایا نہ جائے، اسی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت ۴۲) میں ارشاد ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

اور اگر حدودِ خداوندی کی پابندی نہ کی جائے تو اسے ظلم کہتے ہیں اور ظالموں کے لیے سورۃ الفرقان (آیت ۳۷) میں ارشاد ہے کہ

"اور ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

ظلم کا اطلاق اللہ تعالیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر نافرمانی اور ہر گناہ

کے کام پر ہوتا ہے، خواہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا یعنی حقوق اللہ میں عدل و انصاف کو مدنظر رکھنا لازمی ہے اسی طرح حقوق العباد میں بھی عدل و انصاف ضروری ہے اور حدود کو تجاوز کرنا ظلم اور سخت گناہ ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس شخص کے ذمہ کسی کا حق ہے تو اسے چاہیے کہ دنیا میں اس کو ادا کر دے یا معاف کرا لے، کیوں کہ آخرت میں درہم و دینار تو ہوں گے نہیں، اس لیے اگر ظالم کے پاس کچھ اعمال صالحہ ہوں گے تو ظلم کی مقدار کے مطابق یہ اعمال اس سے لیے کر اس مظلوم کو دے دیے جائیں گے اور اگر اس ظالم کے پاس نیکیاں نہیں ہیں تو مظلوم کے گناہ اس ظالم پر ڈال دیے جائیں گے"۔ اس حدیث کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، ہم اسے مفلس کہتے ہیں جس کے پاس کوئی نقدی نہ ہو اور ضروریات کا سامان نہ ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری امت میں حقیقی مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ بہت سے نیک اعمال کے ساتھ آئے گا اور اس کا حال یہ بھی ہو گا کہ اس نے دنیا میں کسی کو گالی دی، کسی پر تہمت لگائی، کسی کا مال ناجائز طور پر کھایا، کسی کو قتل کیا، کسی کی مار پیٹ کی، تو یہ سب مظلوم، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے مظالم کا مطالبہ کریں گے اور اس ظالم شخص کی نیکیاں ان میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ پھر جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور مظلوموں کے حقوق ابھی باقی ہوں گے تو مظلوموں کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا"۔

اس نصیحت سے واضح ہوا کہ ظالم شخص اپنی بہت سی نیکیوں کے باوجود، قیامت

کے دن مفلس رہ جائے گا اور جہنم میں ڈالا جائے گا۔ ایک اور حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے روز حق والوں کو ان کے حق کا بدلہ دلایا جائے گا، آدمیوں کا کیا ذکر، جانوروں سے بھی ایک دوسرے کا حق دلایا جائے گا، حتیٰ کہ بے سینگ والی بکری کو سینگ والی بکری سے اس کے سینگ مارنے کا بدلہ دلایا جائے گا"۔

یہ سب وعیدیں ہماری صلاح و فلاح کے لیے ہیں اور یقیناً عدل کا تقاضا ہے کہ ظالم سے اس کے ظلم کے مساوی بدلہ لیا جائے۔ سورہ شوریٰ (آت ۴۰) میں ارشاد ہے کہ

وجزآؤ سیئة سیئة مثلها ٥ (اور برائی کا بدلہ اسی کے مثل برائی ہے) ۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے معافی کو پسند فرما کر معاف کرنے والے کا اجر اپنے ذمہ لیا ہے اور فرمایا ہے کہ: **فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ** ٥ یعنی "جس شخص نے معاف کر دیا اور صلح کر لی، تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ یعنی معاف کر دینے والا ان احسان کرنے والوں میں سے ہو گا جس کا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے اور وہ اجر یقیناً بے پایاں ہو گا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دشمنوں سے بھی بدلہ نہیں لیتے تھے اور ان کو معاف فرما دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک امتیازی شان کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ

"میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو کوئی مجھ پر ظلم و زیادتی کرے، میں انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے بھی اس کو معاف کر دوں گا جو مجھ سے قطع تعلق کرے، میں اس کو ملاؤں۔ جو مجھے محروم رکھے، میں اسے عطا کروں، غصہ اور خوشی دونوں حالتوں میں حق گوئی کو اپنا شیوہ بناؤں"۔

فتح مکہ کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو رویہ دشمنوں کے ساتھ تھا، وہ دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ابو سفیان جو بدر، احد، خندق وغیرہ کی جنگوں کے وقت دشمنوں کا سرغنہ تھا اور جس نے بہت سے مسلمانوں کو شہید کیا تھا، آج معاف کر دیا گیا۔ وہ کفار جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے آج معاف کر دیے جاتے ہیں

جو لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف ایذائیں پہنچاتے تھے، ہجو کرتے تھے، پتھر برساتے تھے، کانٹے بچھاتے تھے، لہولہان کرتے تھے، اوجھ پھینکتے تھے، آپؐ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جس نے کلیجہ چبایا تھا، بے حرمتی کی تھی، صحابہؓ کو جلتی ریت پر لٹایا تھا، دہکتے ہوئے کوئلوں سے ان کا جسم داغا تھا، تیروں کی انیوں سے ان کے بدن چھیدے تھے، آج وہ سب کے سب **لا تثریب علیکم الیوم** (یعنی، آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں) سن کر آزاد ہوتے ہیں۔ عفو و درگزر اور احسان کے متعلق یہ واقعہ دنیا کی تاریخ میں، اپنی مثال آپ ہے۔ عدل کیا جاتا تو دس ہزار خون آشام تلواریں آج کے دن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر چلائی جا سکتی تھیں، لیکن احسان کیا گیا تو ہر دشمن معاف اور ہر ظلم ہمیشہ کے لیے بری المواخذہ قرار دیا گیا۔

اللھم صلی علیٰ سیدنا و مولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

پڑوسیوں کے حقوق

انسانی معاشرہ اپنے پرائے، عزیز اور بیگانے سبھی سے تعلقات استوار رکھنا چاہتا ہے۔ کون ہے جو الگ تھلگ اور سب سے دور رہ کر زندگی گزار سکتا ہے۔ صبح سے شام تک کی زندگی میں بکثرت معاملات ایسے درپیش ہوتے ہیں کہ کسی نہ کسی سے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، غرض کہ ہر معاملے میں کسی نہ کسی ساتھی سے تعلق ضروری ہوتا ہے۔ اسلام یہی چاہتا ہے کہ ہماری زندگی اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی مفید ہو اور حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ **خیر الناس من ینفع الناس**، یعنی "(تم میں) سب سے اچھا انسان وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے"۔

اسلام اسی محبت اور رفاقت سے ایک صالح معاشرہ پیدا کرتا ہے، جہاں بھائی بھائی ہی میں نہیں، پڑوسی اور ہر طرح کے رفیق میں بھی موانست اور اخوت ہو۔ سفر کے دو رفیق، استاد کے دو شاگرد، کارخانے کے دو ملازم، دکان کے دو ساتھی بھی محبت اور اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اور اپنے باہمی معاملات میں شریکِ کار بن سکیں۔ سورۃ النساء (آیت ۳۶) میں ارشاد ہے کہ:

> "اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ سے بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے ہم سائے اور دور کے ہم سائے اور کروٹ کے ساتھی اور راہ گیر اور اپنی باندی غلام سے۔ بے شک اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی

اترانے والا، بڑائی مارنے والا"۔

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے کی فلاح و خیر کے لیے تمام ذرائع کا ذکر فرمایا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی اطاعت سے تمام غیر اللہ طاقتوں سے بے نیازی پیدا ہو گی ۔ ماں باپ کی خدمت سے نہ صرف ان کی دعائیں اور شفقتیں حاصل ہوں گی، بلکہ ہر شخص کے دل میں فرماں بردار اولاد کی عظمت پیدا ہوتی ہے اور پھر فرماں بردار اولاد کی اولاد بھی فرماں بردار ہوتی ہے ۔ پھر اسی آیتِ مبارکہ میں رشتہ داروں، یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم ہے ۔ رفیق خانہ ، رفیق سفر، رفیق مسجد، رفیق مجلس، سبھی کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر اور مہمان کے لیے فرمایا ہے کہ

"جو شخص اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھے، اسے چاہیے کہ مہمان کا اکرام کرے"۔

غلام اور باندی کے لیے ارشاد فرمایا ہے کہ

"انھیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو اور سخت کلامی نہ کرو اور کھانا کپڑا بقدرِ ضرورت دو"۔

پھر آیتِ مبارکہ میں "اترانے والے اور بڑائی مارنے والے" کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں فرماتا ۔ وجہ یہی ہے کہ وہ لوگ اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو ذلیل سمجھتے ہیں ۔ سورۃ النساء کی صرف یہی آیت ہمارے معاشرے کی فلاح و صلاح کے لیے کافی رہنمائی بہم پہنچاتی ہے ۔

ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہو گا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہو گا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہو گا"۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ، کون؟" آپؐ نے فرمایا "وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں"۔ یعنی پڑوسی کو ستانے والا مومن ہی نہیں ہو گا، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ

عذاب الٰہیٰ میں گرفتار ہو گا۔ ایک اور موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے"۔

یعنی پڑوسی کی عزت کرنے والا ہی مومن کہلایا جائے گا۔ ذرا ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہم اپنی خود سری کی وجہ سے کتنے پڑوسیوں کی عزت کرتے ہیں اور کہاں تک ہم مسلمان کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ایک مرتبہ کوئی چیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کسی پڑوسی کو بھیجنا چاہتی تھیں۔ وہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ دو پڑوسیوں میں سے کس کو وہ چیز بھیجی جائے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حل معلوم کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا کہ "جو پڑوسی تمھارے مکان سے (زیادہ) قریب ہے، اس کو بھیج دو"۔ ایک موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے"۔

یعنی اچھا ساتھی اور اچھا پڑوسی وہی ہے جو اچھا سلوک کرے، تاکہ خود اس کو سکون اور اطمینان کی زندگی نصیب ہو اور محلے میں فتنہ و فساد پیدا نہ ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

" حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے ہم سایہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہمیشہ تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ پڑوسی کو وارث بنا دیں گے"۔

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ

"جب تم سالن پکاؤ تو اس میں پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہم

سایوں کی خبر گیری کرتے رہو"۔

ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ

"وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ پڑوسی کو بھوکا جانتے ہوئے بھی اس کی خبر گیری نہ کرنا کس قدر مروت اور شرافت کے خلاف ہے، جب کہ ہمارا دین ہر ہر قدم پر مروت اور شرافت کے لیے حکم کرتا ہے۔ دو صحابیہ کا ذکر بھی حدیث میں آتا ہے کہ ان میں سے ایک ایسی تھیں جو رات بھر نمازیں پڑھا کرتی تھیں، دن کو روزے رکھتی تھیں، صدقہ و خیرات بھی خوب دیتی تھیں، لیکن زبان کی تیز تھیں اور پڑوسیوں کو ستاتی تھیں۔ صحابہؓ نے ان کا حال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "ان میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملے گی"۔ پھر صحابہؓ نے ایک اور خاتون کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھتی تھیں اور معمولی صدقہ دیتی تھیں، مگر کسی کو ستاتی نہیں تھیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" وہ جنتی ہوں گی"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر تو یہاں تک فرمایا ہے کہ

" تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک کہ اپنے پڑوسیوں کی جان کے لیے وہی محبت نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لیے رکھتا ہے"۔

یعنی پڑوسی کی جان سے پیار رکھنا بھی ایمان رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ گویا ہر مومن کے لیے یہ بھی ایک ضروری امر ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کی جان و مال سے بھی محبت رکھے، تاکہ اس کی اور خود اپنی زندگی عافیت اور سکون کے ساتھ گزار سکے۔ اسلام ایسا ہی معاشرہ ہم کو عطا کرتا ہے جس کی قدر و منزلت صرف مومن کے دل میں ہو سکتی ہے اور جس کے بننے سے اس کا بھی بناؤ ہے اور انسانیت کا بھی بناؤ ہے۔

بعض پڑوسی اپنی محتاجی اور معذوری کی وجہ سے اور بھی زیادہ مدد کے مستحق

ہوتے ہیں، جیسے یتیم، بیوہ، ضعیف یا اپاہج لوگ۔ان کی خدمت مال سے بھی کرنی چاہیے، ہاتھ پاؤں سے بھی اور زبان کی تسلی اور تشفی سے بھی۔اس طرح ان کی دل جوئی ہوتی ہے اور پورے معاشرے میں محبت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔اسلام یہی چاہتا ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پرامن زندگی کے لیے تبلیغ فرمائی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

خواتین کے حقوق

اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں عورتوں کی حیثیت بہت پامال تھی۔ Roman Law اور Ancient Law کے مطابق وہ مال و اسباب کی طرح فروخت کی جاتی تھی، قرض داروں کو قرض کے بدلے پیش کر دی جاتی تھی، شوہر کے مرنے کے بعد میراث میں وارثوں کے حصے میں آجاتی تھی۔ بعض قومیں تو عورت کو نجس اور ذلیل سمجھتی تھیں، اسی لیے لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زندہ در گور کر دیا جاتا تھا۔ ایرانی رسم و رواج کے مطابق باپ اپنی بیٹی کو بیوی بنا لیتا تھا۔ یورپ جسے آج کل بہت مہذب سمجھا جاتا ہے، قریب تین سو سال پہلے عورت کو تعلیم سے بے بہرہ رکھتا تھا۔ آج بھی مغربی تہذیب میں ایک جوان لڑکی اپنے ماں باپ سے قانوناً آزاد ہو کر بے سہارا ہو جاتی ہے اور دربدر کسی سہارے کی تلاش میں پھرتی رہتی ہے۔ لیکن اسلام واحد دین ہے جس نے عورتوں کے حقوق کو متعین کیا اور انھیں ہر طرح کا تحفظ عطا فرمایا۔ قرآن پاک اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بکثرت احادیث میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کے لیے ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ النساء (آیت ۱۹) میں ارشاد ہے کہ

"عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی زندگی بسر کرو"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث، جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے، اس طرح ہے کہ

"عورتوں کی عزت وہی شخص کرتا ہے جو شریف النفس ہوتا

ہے اور ان کی بے عزتی وہ شخص کرتا ہے جو کمینہ ہوتا ہے"۔

عورت اپنی زندگی کی تین اہم منزلوں سے گزرتی ہے۔ جب وہ بچی ہوتی ہے تو ماں باپ اور بہنوں، بھائیوں کے دلوں کا سرور اور آنکھوں کا نور ہوتی ہے۔ ہر شخص پیار اور محبت سے پیش آتا ہے اور اس کو ڈانٹنا اور مارنا بھی معیوب سمجھتا ہے۔ لیکن جب وہ زندگی کی دوسری منزل یعنی جوانی کی منزل میں داخل ہوتی ہے تو اس کے لیے نئے نئے تجربے در پیش ہوتے ہیں۔ اس کی شادی ہوتی ہے تو بعض جاہل گھرانوں میں ساس، نند اور دیور اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ اس بے چاری کے لیے نیا ماحول ہوتا ہے، لیکن محاذ آرائی کی وجہ سے اسے اس ماحول سے نمٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے گھرانوں کی ساس اپنی بہو سے اپنی ساس کا بدلہ لیتی ہے، یعنی اس کو اس کی ساس نے ستایا تھا تو اس کے بدلے میں اپنی بہو کو ستاتی ہے اور یہ بات بالکل اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک استاد اپنے شاگرد کی پٹائی اس لیے کرتا ہے کہ وہ بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسی طرح پیٹا گیا تھا۔ ہمارے جاہل معاشرے میں یہ کتنا بڑا ظلم ہے، حالاں کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شوہر سے الگ مکان کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اور یہ بھی فتویٰ متفقہ ہے کہ

> "جس شخص کی مالی وسعت اس قدر کم ہے کہ اگر ماں باپ کی پوری خدمت کرے تو بیوی بچوں کو تکلیف ہونے لگے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ بیوی بچوں کو تکلیف پہنچائے۔ ماں باپ کی خدمت کے لیے دوسرے بھائی یا ان کے دوسرے عزیز اگر انتظام کر سکتے ہیں تو وہ کریں، ورنہ جتنی اپنی وسعت ہے اس میں ماں باپ اور بیوی بچوں کا یکساں انتظام کرے"۔

یعنی بیوی کے حقوق شوہر پر عائد ہوتے ہیں جن سے عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے۔ پھر قرآن پاک میں میاں بیوی کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی تاکید آئی ہے

سورۃ البقرہ (آیت ۲۲۸) میں ارشاد ہے کہ

"عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے
کہ مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں"۔

عورتیں اگر گھر کی ملکہ ہیں تو مرد گھر کے سردار ہیں، جیسا کہ سورۃ النساء (آیت ۳۴) میں ارشاد ہے کہ

"مرد سردار اور نگراں ہیں عورتوں پر"۔

یہ حکم اس لیے ہے کہ گھر کا وہ ایک ایسا ذمہ دار فرد ہے جو گھر کے اندر اور گھر کے باہر کے بھی تمام معاملات صحیح طور پر نمٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوست دشمن کے لیے بھی اس کا وجود ضروری ہوتا ہے، معاش اور معاشرت کے کاموں میں بھی اسے پیش پیش ہونا پڑتا ہے اور وہ ایسے تمام نازک معاملات کو بھی فیصل کر سکتا ہے جن تک عورت کی رسائی مشکل ہوتی ہے۔

پھر عورت کی زندگی کی تیسری منزل شروع ہوتی ہے جو سراپا تقدس اور احترام ہی احترام ہے، یعنی اس کی وہ حیثیت جب کہ وہ ماں ہو جاتی ہے اور جنت اس کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔ اللہ پاک نے اپنی عبادت کے بعد ہی والدین کے حقوق کا اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب مل کر بھی اس طرح کا احترام پیش نہیں کر سکتے۔ سورہ۔ بنی اسرائیل (آیت ۲۳) میں ارشاد ہے کہ:

تمھارے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی
عبادت نہ کرو اور اپنے والدین کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو۔ اگر تمھارے
سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تم ان کو
اف بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان کے ساتھ ادب و احترام سے
بات کرو"۔

ان کے سامنے بے ادبی تو کجا، ان کو اف بھی نہ کہو۔ کس قدر عظیم احترام ہے

اور اولاد کے لیے کتنی بڑی سعادت ہے۔ یعنی یہ ایسا بلند مقام ہے کہ مغرب کا کوئی مہذب معاشرہ اس طرح سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ قومیں جو اپنے بوڑھوں کو سرکاری جائے پناہ میں چھوڑ آتی ہیں اور پھر کبھی ان کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھتیں یا وہ قومیں جو اپنے بوڑھے ماں باپ سے بھی مشین کے پرزوں کی طرح کام لینا چاہتی ہیں اور ان کے تھک جانے پر ان کی پیٹھ پر ٹھوکر لگاتی ہیں، وہ کیا جانیں کہ اف بھی نہ کہنا کیا چیز ہے؟

پھر ماں باپ کے حقوق میں ماں کے احترام اور اس کی خدمت کو جس طرح اسلام نے فوقیت دی ہے، وہ بھی کسی قوم میں نہیں ہے۔ ایک حدیث ہے کہ

"ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضورؐ، میرے اچھے سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ حضور نے فرمایا کہ تمھاری ماں سب سے زیادہ حق دار ہے۔ اس شخص نے عرض کیا کہ پھر کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، تمھاری ماں۔ اس نے پھر عرض کیا کہ پھر کون؟ حضورؐ نے فرمایا، تمھاری ماں اس نے پھر عرض کیا کہ پھر کون ہے؟ حضور نے ارشاد فرمایا، پھر تمھارا باپ حق دار ہے یعنی چوتھا درجہ باپ کو دیا گیا۔ سورۃ الاحقاف (آیت ۱۵) میں ماں کی حیثیت پر اس طرح زور دیا گیا ہے کہ

> "اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں اس کی کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے زمانہ، حمل میں اٹھائے اٹھائے پھری اور پھر اس کی پیدائش کے وقت بے حد تکلیف برداشت کی، اور حمل کے شروع سے دودھ چھڑانے کی مدت تک جو کہ تیس مہینے ہے، کس قدر تکلیف سے اسے رکھا"۔

ماں باپ کی تعظیم اور خدمت سے متعلق بہت سی احادیث ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ، ماں باپ کا اپنی اولاد پر کیا

حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ تیرے لیے جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی ہیں۔

یعنی ان کو راضی رکھنے میں جنت ہے اور ان کو ناراض کرنے میں دوزخ ہے۔

ایک اور حدیث ہے کہ

"جو لڑکا اپنے والدین کا مطیع و فرماں بردار ہو، جب وہ اپنے والدین کو عزت و محبت کی نظر سے دیکھتا ہے تو ہر نظر کے بدلے میں اس کو ایک مقبول حج کا ثواب ملتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اس طرح کرے تو کیا پھر بھی اسی طرح ثواب ملتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں سو مرتبہ بھی"۔

یعنی ہر نظر میں یہی ثواب ملتا رہے گا کہ اللہ تعالیٰ بڑی شان والا ہے۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی۔

آپؐ نے دیکھا کہ ایک بچی، ایک بیوی اور ایک ماں کے حقوق کے لیے اسلام نے کس قدر رغبت دلائی ہے اور ان کی تعظیم و تکریم میں کتنا ثواب رکھا ہے۔ پھر میراث میں بھی ان سب کے حقوق ہیں۔ بہن، بھانجی اور بھتیجی وغیرہ کے حقوق بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ سب اسلام کے فیوض و برکات ہیں جن سے دوسرے مذاہب اور اقوام محروم ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

حسن معاملہ

انسان کو اپنی اجتماعی زندگی میں بے شمار معاملات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اپنے اور پرائے سبھی سے تعلق رکھنا خود اس کی زندگی کے لیے ضروری ہے اور اس تعلق کو حسن وخوبی کے ساتھ قائم رکھنا اس کے لیے بھی مفید ہے اور معاشرے کے لیے خیر و فلاح کا موجب ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کو سنوارنے اور اس میں توازن اور اعتدال قائم رکھنے کے لیے قرآن پاک کی رہبری ہی کو ضروری قرار دیا ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت ۴۸) میں ارشاد ہے کہ

> "اور ہم نے آپ کی طرف سچی کتاب اتاری، اگلی کتابوں کی تصدیق فرمائی اور وہ ان پر محافظ و گواہ ہے، تو ان (لوگوں) میں فیصلہ کرو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب سے، اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اپنے پاس آئے ہوئے حق کو چھوڑ کر"۔

اور قرآن کی پیروی صرف اس لیے ضروری ہے کہ تمام معاملات اسی کے ذریعے صحیح بن سکتے ہیں اور معاشرے کو صرف اسی سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سورۃ النحل (آیت ۸۹) میں ارشاد ہوتا ہے کہ

> "اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی، ہر چیز کی تشریح کے لیے اور یہ ہدایت، رحمت اور بشارت ہے مسلمانوں کے لیے"۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن اور قرآن والے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے انحراف کرنے والے، خود اپنا نقصان کرتے ہیں اور معاشرے کے لیے ناسور بن جاتے

ہیں ۔انسان کی فلاح و خیر کے لیے اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لیے جو طریقے اسلام نے تعلیم کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ

" نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو"۔

سورۃ المائدہ (آیت ۲) کا یہ ارشاد کس قدر جامع اور عالمگیر ہے ۔اس ارشاد سے معاشرے کے کتنے معاملات سنور سکتے ہیں اور کتنی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں ۔یہاں بے محل نہ ہوگا اگر ایک مثال اس ارشاد کی خلاف ورزی میں ہمارے معاشرے سے متعلق بیان کی جائے، یعنی وہ کرایہ دار اور مالک مکان کا معاملہ ہے ۔کرایہ دار بڑی منت سماجت کر کے مکان کرائے پر حاصل کرتا ہے ۔پھر چند ماہ کے بعد کرایہ دینا بند کر دیتا ہے ۔دیوانی عدالت میں مالک مکان چارہ جوئی کرتا ہے، جس میں کئی کئی سال صرف ہو جاتے ہیں ۔اس دوران میں کرایہ دار مطالبہ کرتا ہے کہ اگر مالک مکان اتنی رقم (مکان دینے کے جرم میں) ادا کر دے تو پھر کرایہ دار اس مکان کو خالی کرنے کے لیے ہمدردی سے غور کر سکتا ہے، **استغفر الله** ۔اس کرایہ دار پر " اس گناہ اور زیادتی پر" دنیا اور آخرت کی جو سزائیں وارد ہوں گی ان کا نمونہ اور ان کا مزہ اسے جلد ہی اس دنیا میں بھی مل جاتا ہے اور آخرت میں جو کچھ ہو گا وہ اسے وہاں درپیش آئے گا۔ بہرحال " نیکی اور تقویٰ" میں تعاون نہ کرنے سے جو پریشانیاں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ۔

قرآن پاک میں جتنے اوامر اور نواہی ہیں، وہ معاملات کو سنوارنے ہی کے لیے ہیں ۔مثلاً امر ہے کہ (سورۃ النساء، آیت ۸۵)

" بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو ادا کر دو"۔

اگر اس حکم کی تعمیل ہو جائے تو کس قدر بددیانتی، بے ایمانی اور عیاری سے نجات ہو سکتی ہے اور ہمارے معاشرے کی کتنی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں ۔ایک

ارشاد ہے کہ (سورہ۔ الرحمن، آیت ۹)

"اور انصاف کے ساتھ تول قائم کرو اور وزن نہ گھٹاؤ"۔

لیکن ہمارا نفس چاہتا ہے کہ ہم کو وزن سے زیادہ چیز مل جائے اور خود جب کسی کو کچھ دیں تو صحیح وزن سے کم دیں۔ ہم اس گناہ کو بہت لذیذ سمجھتے ہیں لیکن عیاری، مکاری اور فریب دہی کی سزاؤں کی پروا نہیں کرتے۔

"اے ایمان والو، بے شک شراب اور جوا اور بت اور فال، شیطان کے عمل کی ناپاکی ہے۔ پس تم اس (ناپاکی) سے بچو تا کہ فلاح پاؤ"۔

بظاہر اس آیت کریمہ میں انفرادی اور شخصی زندگی کی اصلاح کے لیے نہی مذکور ہے۔ یعنی نشہ آور چیز، جوا اور لاٹری وغیرہ سے اجتناب، کسی بت یا شگون وغیرہ سے نفرت سکھائی گئی ہے، لیکن ان چیزوں کے اختیار کرنے سے معاشرے کے معاملات جس قدر تباہ ہوتے ہیں اور جو فسادات پیدا ہوتے ہیں ان سے ہمارے اخبار ہر روز بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہم غلط طریقے سے جو نفع خوری کرتے ہیں اس سے ہمارے معاملات جس حد تک بگڑتے ہیں وہ بھی ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں۔ سورۃ النساء (آیت ۲۹) میں ارشاد ہے:

"اے ایمان والو، آپس میں ایک دوسرے کے مال غلط طریقے سے نہ کھاؤ۔ لین دین آپس کی رضامندی سے ہو (تو یہ اور بات ہے) اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو"۔

حسن معاملہ کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مال کو کسی نہ کسی فریب سے ہڑپ کر لینا اور لین دین میں اپنے وعدے سے پھر جانا خود اپنی اور دوسرے کی ہلاکت اور بربادی ہے۔ چند روزہ نفع کو نفع سمجھنا اور ہمیشہ کے گھاٹے کو گھاٹا اور خسران نہ سمجھنا کتنی بڑی حماقت اور نادانی ہے۔ اسی طرح تجارتی مال میں بری چیز کو

اچھا کہہ کر دوسرے کو فریب دینا دراصل خود کو فریب دینے کے مترادف ہے۔ سورۃ الشعراء (آیت ۱۸۳) میں ارشاد ہے:

"لوگوں کو ان کی چیزیں ناقص نہ دو اور زمین پر فساد کرتے نہ پھرو"۔

ناقص چیز دے کر جو فسادات پیدا ہوتے ہیں اور باہر کے ملکوں کو جب ایسی ناقص چیزیں برآمد کی جاتی ہیں تو قوم اور ملک کی بدنامی ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے۔ واقعی یہ بات کس قدر موجب شرم ہے کہ ہم کہیں کچھ اور کریں کچھ، اور ہم فریب دہی کو ایک ہنر سمجھیں اور جو شخص فریب نہ دے سکے، اسے بے وقوف سمجھیں۔ سورۃ البقرہ (آیت ۴۲) میں ارشاد ہے کہ

"سچ کو جھوٹ کا لباس نہ پہناؤ اور سچ کو نہ چھپاؤ ایسے حال میں کہ تم کو معلوم ہے"۔

بد معاملگی، بے انصافی، بے ایمانی وغیرہ جتنے رذائل ہیں وہ سب اسی لیے ہیں کہ سچ کو جھوٹ کا لبادہ پہنایا جاتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے۔ حالاں کہ سچائی اور انصاف کے لیے بار بار ارشادِ ربانی ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۱۳۵) میں ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! خوب قائم رہو انصاف پر، گواہ بن کر اللہ کے لیے، اگرچہ وہ خلاف ہو تمھارے اپنے یا والدین کے یا اقربا کے۔ اگر کوئی دولت مند ہو یا فقیر، تو اللہ ان کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ پس خواہش کی پیروی نہ کرو کہ اس طرح تم حق سے پلٹ جاؤ گے۔ اور اگر تم زبان پلٹاؤ گے یا منہ پھیرو گے تو بے شک اللہ خوب واقف ہے اس کام سے جو تم کرتے ہو"۔

اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ حق کے لیے کسی رشتے اور تعلق کی پروا نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ خود ہی سب کی بھلائی کرنے والا ہے۔ اپنی ہوا و ہوس کی خاطر جو لوگ

حق کو چھوڑتے ہیں وہ بڑے گھاٹے میں ہیں۔ وہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے ایسے اعمال اللہ پاک سے کبھی چھپ سکتے ہیں۔ پھر حق کو چھپانا جو محض دنیوی فائدے کے لیے ہو جو عارضی ہے، کس قدر مذموم ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے دنیا کی نظر سے کوئی چیز پوشیدہ رکھی جاسکتی ہے، لیکن اللہ پاک سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ پھر وہ ہمارے ظاہر اور باطن سے بھی واقف ہے کہ ہماری کون سی بات حق ہے اور ہماری کون سی بات بد معاملگی کے ذیل میں آتی ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۱۴۹) میں ارشاد ہے:

"اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور پر کرو، یا چھپا کر کرو، یا کسی برائی کو معاف کرو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیوں کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا، قدرت والا ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں حسن معاملہ پر کتنا زور دیا گیا ہے کہ برائی کو معاف کر دو اور اللہ پاک اس قدر قدرت اور طاقت رکھنے کے باوجود معاف فرما دیتا ہے، تو ہم عاجز بندے کیوں معاف نہ کریں اور کیوں اللہ پاک کی سنت کو اختیار نہ کریں۔ حسن معاملہ یہ بھی ہے کہ ہم برائی کا بدلہ بھلائی سے دیں، بلکہ برائی کرنے والے کے ساتھ اس قدر بھلائی کریں کہ وہ برائی کرنا بھول جائے۔ سورہ حٰمٓ سجدہ (آیت ۳۴-۳۵) میں ارشاد ہے:

"اور نیکی اور بدی برابر نہیں۔ (پس) برائی کا جواب نیکی سے دو۔ پھر دیکھو گے کہ وہ جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ رشتہ والا دوست۔ اور یہ بات انھی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے"۔

گویا اس ارشاد سے یہ واضح ہو گیا کہ برائی کرنے والے کے ساتھ اس قدر بھلائی کی جائے کہ وہ برائی کرنا بھول جائے اور نیکی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس سے بہتر حسن معاملہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

تواضع

تواضع وضع سے ہے جس کے معنی رکھنے اور ڈالنے کے ہیں ۔ اصطلاح میں تواضع کے معنی فروتنی اور خاکساری کے ہیں اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو انسان ہی کو زیب دیتی ہے، کیوں کہ وہ مٹی سے بنایا گیا ہے، جس کی خاصیت فروتنی ہی ہے اور جو سرکشی سے ناآشنا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال کو اپنے بندے کی فروتنی اور خاکساری بہت پسند ہے، کیوں کہ شان رفعت اور شان کبریائی صرف اللہ پاک کو زیبا ہے، جیسا کہ سورۃ الجاثیہ (آیت ۳۷) میں خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ:

"اور اسی (اللہ) کو بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا"۔

اللہ پاک کی کبریائی اور عظمت کے مقابلے میں انسان کی فروتنی کا اندازہ سورۃ النبا کی آخری آیتوں سے ہو سکتا ہے کہ جب حساب کتاب کا دن آئے گا تو "وہ دن برحق ہے ۔ پھر جو چاہے بنا رکھے اپنے رب کے پاس ٹھکانا ۔ ہم نے خبر سنادی تم کو ایک آفت نزدیک آنے والی کی ۔ جس دن دیکھ لے گا آدمی جو آگے بھیجا ہے، اس کے ہاتھوں نے اور کہے گا کہ کافر، کاش میں مٹی ہوتا"۔

یہاں کافر سے مراد عام کافر بھی ہے اور بعض مفسرین کے نزدیک یہاں شیطان مراد ہے جو اپنے کرتوت کی سزا دیکھ کر کہے گا کہ میں مٹی ہوتا تو یہ عذاب نہ ہوتا ۔ غرض کہ تراب یا مٹی ہو جانا فروتنی کی علامت سمجھی جاتی ہے، جو مٹی سے پیدا ہونے والے انسان کی ہستی کے عین مطابق ہے ۔

تواضع کے لیے قرآن پاک میں "خفض جناح" کا استعارہ بھی آیا ہے۔ پرندے کے بازو کو جناح کہتے ہیں۔ پرندہ اترتے یا بیٹھتے وقت اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے، اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے لیے اپنے بازو جھکا دے۔ سورہ۔ بنی اسرائیل (آیت ۲۴) میں ارشاد ہے:

"اور جھکا دے ان کے (والدین کے) آگے کندھے عاجزی کر کے، نیاز مندی سے اور (یہ بھی) کہہ کہ اے رب، ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے مجھے پالا چھوٹا سا"۔

یعنی جب میں بالکل ناتواں تھا تو میرے والدین نے میری پرورش اور تربیت میں اپنی ہر راحت کو قربان کیا۔ اس آیت میں والدین کے آگے کندھوں اور بازوؤں کے جھکانے کا حکم بھی ہے اور ان کے لیے عاقبت بخیر کی دعا کے لیے بھی ارشاد ہے۔ سورہ۔ لقمان (آیت ۱۸-۱۹) میں حضرت لقمان نے جو نصیحت اپنے بیٹے کو کی تھی، اس میں بھی فروتنی اور خاکساری کی تعلیم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور اپنے گال مت پھلا لوگوں کی طرف (یعنی لوگوں سے بے رخی نہ کرو) اور زمین پر اترا کر مت چل، (کیوں کہ) اللہ کسی اترانے والے، شیخی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کر اور (کسی سے بات کرے تو) نرمی سے بات کر، (کیوں کہ) بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے"۔

دیکھیے کس قدر شفقت اور محبت والے رویے کی تعلیم ہے! لیکن ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ ذرا سا اقتدار مل جاتا ہے تو ہم اپنے زیردستوں یا کم درجے والوں سے گال پھلا کر اور کندھے کھڑے کر کے بات کرتے ہیں، اکڑ کر چلنے میں اپنی شان سمجھتے ہیں، شیخی اور خودستائی کی باتیں کر کے دوسروں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ چلتے اس طرح ہیں کہ گویا پوری فرعونیت ہمیں کو حاصل ہے، بات اس طرح کرتے ہیں کہ جس سے

آواز کرخت ہو جاتی ہے۔ اللہ پاک نے ایسی آواز کو گدھے کی آواز سے تشبیہ دی ہے۔ حضرت لقمان کی یہ نصیحت (جو مذکورہ بالا آیت میں ہے) ان کے صاحبزادے کے لیے ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عام لوگوں کے لیے نصیحت اور ایسی ہدایت ہے جس سے تمام غرور و تکبر کے تار و پود بکھر کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے آقا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۃ الحجر (آیت ۸۸) میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے کہ "آپ اپنے بازو جھکائیے ایمان والوں کے لیے"۔

یعنی آپ ملاطفت اور تواضع کے ساتھ ہر مسلمان سے پیش آئیں اور یوں بھی آپؐ کی یہ صفت سورہ آل عمران (آیت ۱۵۹) میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ

"پس کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے نرم دل مل گئے۔ اگر آپ تند خو، سخت دل ہوتے تو وہ لوگ متفرق ہو جاتے آپ کے پاس سے۔ پس آپ ان کو معاف کر دیں اور ان کے لیے مغفرت چاہیں اور ان سے مشورہ لیں کام میں۔ پھر جب آپ قصد کر چکیں کسی کام کو تو پھر اللہ پر بھروسا رکھیں۔ بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔

دیکھیے اس آیت کریمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم دلی، نرم جوئی اور خوش اخلاقی کا کیسا پیارا ذکر ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جس کے ڈانڈے صرف تواضع اور خاکساری سے ملتے ہیں اور یہاں کسی غرور و تکبر کا دور دور تک واسطہ نہیں ہے۔ رفق، نرمی، حلم و ملاطفت ایسے جوہر ہیں جن سے لوگوں کی اصلاح ہوتی ہے اور مغرور سے مغرور شخص بھی ایسی خوبیوں والے کے سامنے مٹی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بڑے سے بڑا سرکش اور سخت سے سخت دل والا شخص ذرا دیر میں متواضع اور خاکسار بن جاتا تھا اور اپنی تمام فرعونیت کو دریا برد بنا دیتا تھا۔ اللہ پاک نے اپنے نیک، مخلص اور پاکیزہ بندوں کی ایک

خصوصیت یہی فروتنی اور خاکساری بتائی ہے ۔ سورۃ الفرقان (آیت ۶۳) میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور رحمت والے اللہ کے (خاص) بندے وہ ہیں، جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل (اور ناسمجھ) لوگ ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو وہ ان کو سلام کریں (الگ ہو جائیں)"۔

یعنی اللہ کے ایسے خاص اور مخلص بندے اپنے ہر قول اور فعل سے بندگی کا اظہار کرتے ہیں ۔ ان کی چال ڈھال سے تواضع اور انکساری ظاہر ہوتی ہے اور وہ متکبروں کی طرح زمین پر اکڑ کر نہیں چلتے ۔ اس آیت مبارکہ کا یہ مقصد نہیں کہ ایسے لوگ ریا اور تصنع سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ کے خاص بندوں کے کسی عمل سے غرور اور تکبر ظاہر نہیں ہوتا ۔ فروتنی اور انکساری ان کا شیوہ ہوتا ہے اور غلط قسم کے لوگوں سے وہ دور رہتے ہیں ۔ یہاں یہ بات ضرور ملحوظ رہے کہ اسلام فروتنی اور انکساری کی تعلیم دیتا ہے، لیکن وہ کبھی ایسی فروتنی نہیں سکھلاتا جس سے انسان کی خودداری کو ٹھیس لگے ۔ حضور انور صلی اللہ وسلم کے ساتھ جب صحابہ کرامؓ عمرہ کرنے کے لیے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں وبائی بخار کی وجہ سے بیمار رہ چکے تھے، اسی لیے کمزور بھی ہو گئے تھے ۔ مکہ معظمہ میں جو کفار تھے انھوں نے ان کو دیکھ کر طنز کیا اور کہا کہ محمدؐ اور ان کے صحابہؓ اپنے ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے ۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ طواف کے ابتدائی تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکوں اور کافروں پر ظاہر ہو کہ وہ حضرات کمزور نہیں ہیں ۔ طواف میں اس طرح تین چکروں میں اکڑ کر چلنے ہی کو رمل کہتے ہیں ۔ جنگ میں بھی کافروں کو مرعوب کرنے کے لیے تکبر کا اظہار کرنا اللہ پاک کو پسند ہے ۔ حدیث میں آتا ہے کہ "بعض غرور کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے اور بعض کو پسند کرتا ہے ۔ جنگ اور صدقہ کے موقع پر اترانا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور ظلم و فخر پر اترانا

ناپسند ہے"۔ یعنی اللہ کی رضا کے لیے تکبر کیا جائے تو ایسا تکبر بھی اللہ کو محبوب ہے او. اگر اپنی رضا کے لیے تکبر ہو تو ایسا تکبر یقیناً اللہ کے نزدیک مردود ہے۔ اسی طرح ایک حدیث ہے کہ "جو شخص اللہ کے لیے خاکساری کرتا ہے اللہ اسے بلند کر دیتا ہے"۔ یعنی تکبر اور خاکساری دونوں صرف اللہ کی رضا کے لیے چاہییں۔ بلکہ انسان کا ہر قول اور ہر فعل صرف اللہ کی رضا کے لیے ہونا ضروری ہے، جیسا کہ ہم کو سورۃ الانعام (آیت ۱۶۳) میں اس عقیدے کی تعلیم دی گئی ہے کہ

"بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے، جو سارے جہانوں کا رب ہے"۔

جب مسلمان کی زندگی اس طرح ہو گی تو ظاہر ہے کہ وہ صرف اللہ کی خوشنودی کو ہر معاملے میں پیش نظر رکھے گا اور اسے دنیا محض گزرگاہ معلوم ہو گی، کیوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"دنیا میں مسافر کی طرح رہ یا اس طرح جیسے راہ چلتا شخص ہو اور گن لے اپنی جان کو قبر والے مردوں میں"۔

چناں چہ جب دنیا کی حقیقت ہماری نظر میں اس طرح ہو گی تو اس فانی زندگی میں غرور اور تکبر کیوں کر پیدا ہو گا اور تواضع اور خاکساری کیوں نہ ہمارا شیوہ ہو گا؟ ایک اور موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو، تاکہ کوئی شخص کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی شخص کسی کے مقابلے میں فخر نہ کرے"۔

جس معاشرتی زندگی میں اونچ نیچ سے ناہمواری پیدا نہ ہو بلکہ توازن اور اعتدال قائم رہے اور انسان یہ سمجھے کہ یہ دنیا بے حقیقت ہے اور یہاں سے اسے ایک دن کوچ کرنا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بزرگوں کا احترام

اسلام ہمارے لیے ایک ایسی رحمت بن کر آیا ہے کہ صرف اسی کی بدولت ہمارا نظام زندگی درست ہو سکتا ہے ۔ انسانی معاشرہ اسی وقت درست ہو سکتا ہے، جب کہ ہم اسلامی اصول کو اپنائیں اور حقوق العباد کو ادا کرنے کی کوشش کریں ۔ ماں باپ، اولاد، اعزا اور اقربا، پڑوسی، مسلمان، غیر مسلم سب کے حقوق اسی لیے متعین کیے گئے ہیں کہ ان کا پاس کرنے ہی سے نظام معاشرت درست ہو سکتا ہے اور انسانی زندگی کو فلاح و خیر حاصل ہو سکتی ہے ۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلے دو بزرگ یعنی ماں باپ ہوتے ہیں ۔ ماں باپ تو اس کی تربیت اور پرورش کرتے ہیں، لیکن وہ خود جب ہوش سنبھالتا ہے تو اسے ان دونوں کی تعظیم اور احترام لازم ہے ۔ سورۃ النساء (آیت ۳۶) میں ارشاد ہے:

> "اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی پڑوسی اور اجنبی ہم سایہ اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنے غلام اور باندیوں کے ساتھ نیکی کرو" ۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان سب کے حقوق کا ذکر فرما دیا جن سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے اور جن سے یہ معاشرہ عبارت ہے ۔ ماں باپ کے حقوق کے لیے تو سورہ بنی اسرائیل (آیت ۲۳ ۔ ۲۴) میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے

"اور تیرا پروردگار حکم دے چکا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا، اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے آگے عاجزی و نرمی کے ساتھ جھکے رہنا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرما، جیسا کہ انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا۔"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ ہی والدین کے ساتھ احترام اور حسن سلوک کرنے کا تفصیل سے حکم دیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو اولاد اپنے والدین کی مطیع ہو جب وہ اپنے والدین کی طرف عزت اور محبت سے دیکھتی ہے تو ہر نظر کے بدلے میں اسے ایک حج مقبول کا ثواب ملتا ہے"۔ لوگوں نے عرض کیا کہ "(حضور!) اگر وہ اولاد دن میں سو مرتبہ بھی اسی طرح نظر کرے؟" حضورؐ نے فرمایا، "ہاں سو مرتبہ بھی، یعنی ہر نظر پر یہی ثواب ملتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ بڑی شان والا ہے، اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی"۔ اس کے برعکس یہ بھی ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری کرتا ہے اس کو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کر دیتا ہے"۔

اولاد جب بڑی ہوتی ہے تو تعلیم حاصل کرتی ہے یا شادی بیاہ کرتی ہے تو اسلام میں استاد اور ساس سسر کے حقوق بھی ماں باپ کے حقوق کی طرح لازم فرمائے گئے ہیں اور ان کی اطاعت، خدمت اور عزت اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ ماں باپ کے لیے ضروری ہے۔ پھر بڑے بھائی کا ادب و احترام بھی چھوٹے بھائی پر والد کے درجے

میں لازم کیا گیا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ "چھوٹے بھائی پر بڑے بھائی کا حق ایسا ہی ہے جیسا کہ باپ کا حق اپنے بیٹے پر ہے"۔ اسی طرح تمام مسلمانوں اور تمام انسانوں کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ رحمت اور شفقت کے ساتھ پیش آئیں اور بڑوں کا ادب کریں اور چھوٹوں پر شفقت کریں۔ ایک حدیث یہ بھی ہے کہ "جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے اور نیکی کا امر نہ کرے اور برائی سے منع نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

حدیث پاک کے اس مضمون کی حقانیت اس صالح معاشرے میں دیکھیے جہاں اس پر عمل ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے سے چھوٹوں پر رحم کرتا ہے اور ان پر شفقت کرتا ہے تو چھوٹے بھی اس سے ادب واحترام کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو شخص اپنے بڑوں کا ادب واحترام کرتا ہے اور ان کی خدمت کرتا ہے تو وہ خود بھی بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح وہ نہ صرف اپنے کنبے اور اپنے شہر میں بلکہ پورے معاشرے اور عالم انسانیت میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ: "جس جوان نے کسی بوڑھے کی تعظیم اس کے بڑھاپے کی وجہ سے کی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے بڑھاپے کے وقت اس کے لیے بھی ایسے شخص کو مقرر فرماتا ہے جو اس وقت اس کی تعظیم کرتا ہے"۔ ایک اور روایت ہے کہ "مخلوق خدا پر رحم کرنا، ان کے ساتھ شفقت سے پیش آنا اور ایک دوسرے کا ادب واحترام کرنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے اور ایسے شخص پر اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت ہوتی ہے اور اس کے برعکس جو شخص، مخلوق خدا کے ساتھ ظلم کرتا ہے اور سختی سے پیش آتا ہے اور لوگوں کے ساتھ بے ادب و گستاخ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی ایسے شخص پر رحمت نازل نہیں کرتا، بلکہ اس پر اپنا قہر نازل کرتا ہے"۔ گویا اس حدیث پاک میں مومن اور کافر بلکہ عام انسان کے احترام کے لیے بھی حکم ہے۔

ایک حدیث یہ بھی ہے کہ "جب کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی ایسے

موقع پر مدد نہیں کرتا جب کہ اس کی بے حرمتی کی جارہی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جارہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی دنیا و آخرت میں ایسے موقع پر مدد نہیں کرے گا جب کہ وہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی مدد اس جگہ کرتا ہے جہاں اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو اور اس کی بے حرمتی کی جارہی ہو تو اللہ تعالیٰ اس شخص کی مدد اس جگہ فرمائے گا، جہاں وہ چاہے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے"۔ اس حدیث پر غور کرنے کی بہت ضرورت ہے، ایسے موقع پر جب کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو ایذا پہنچانے میں اور ان کے حقوق پامال کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اسلام ہمارے لیے سراپا رحمت ہے۔ وہ یہی چاہتا ہے کہ تمام مسلمان اور تمام انسان آپس میں محبت رکھیں، ایک دوسرے کا احترام کریں، ایک دوسرے کی خدمت کریں، بغض و حسد، عداوت و نفرت سے دور رہیں، اگر کسی سے کوئی اذیت بھی پہنچی ہو تو اسے معاف کر کے اس سے بھلائی کریں۔ قیامت میں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں شخص کیسا ہے؟ وہاں تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم کیسے ہو؟ ہر شخص اپنے عمل کا جواب دے گا۔ تو ہم کسی سے نفرت کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کریں؟ سورہ بنی اسرائیل (آیت ۷۰) میں ارشاد ہے:

"اور ہم نے آدم (علیہ السلام) کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور سمندر میں سواری دی اور ہم نے ان کو پاکیزہ اور عمدہ رزق عطا فرمایا اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی"۔

اس آیت مبارکہ میں "سواری دینا" بھی عزت دینے کے مترادف ہے اور پاکیزہ رزق دینا بھی ایک فضیلت ہے۔ دوسرے حیوانات کو نہ تو سواری حاصل ہے اور نہ پاکیزہ رزق حاصل ہے۔ تو پھر جب اللہ تعالیٰ بنی آدم کے لیے احترام اور فضیلت کے ذرائع مہیا کرتا ہے تو پھر ہم کون ہیں جو ایسے فضیلت والے انسان کی بے حرمتی

سورۃ الحشر (آیت ۹) میں تو یہاں تک ارشاد ہے کہ

" ایمان والے لوگ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان پر فاقہ ہی گزر رہا ہو۔ اور جو لوگ اپنے نفس کو حرص سے بچا لے گئے ہیں وہی کامیاب ہیں"۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ احترام، محبت، شفقت، عفو ودرگذر وغیرہ پاکیزہ اخلاق کی تبلیغ میں صرف ہوئی۔ اگر ہم آپؐ کے امتی ہیں تو دیکھیں کہ ہم کس کس کا احترام کرتے ہیں اور کس کا نہیں کرتے اور کیوں؟

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

فتح مکہ

ہجرت کے بعد قریش اور اسلام کی جتنی جنگیں ہوئیں، ان میں سنہ ۵ھ۔ ہجری تک حملے کی پہل ہمیشہ قریش نے کی۔اس کے بعد دوسرے سال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ عمرہ کیا جائے، کیوں کہ عمرہ ہر زمانے میں کیا جاسکتا ہے۔ آپؐ نے مکہ معظمہ کے لیے عام راستہ چھوڑ کر حدیبیہ کا راستہ اختیار کیا اور اعلان بھی کرا دیا کہ مسلمانوں کا مقصد جنگ نہیں بلکہ محض عمرہ ہے۔ پھر بھی قریش نے بدگمانی کی اور مسلمانوں کو روکنے کے لیے مضبوط فوجی دستے مقرر کیے، جنھوں نے مکہ معظمہ کے لیے تمام راستے بند کر دے۔ بہرحال معاہدہ ہوا۔لیکن ہجرت سے ساڑھے آٹھ برس کے بعد آپؐ نے فتح مکہ کا ارادہ کیا۔بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ رمضان مین دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے اور یہ مدینہ میں آپؐ کے آنے سے ساڑھے آٹھ برس بعد کا واقعہ ہے۔ (اس سفر میں) آپؐ بھی روزہ رکھتے تھے اور آپؐ کے صحابہؓ بھی، حتیٰ کہ جب آپؐ کدید پہنچے، تو عسفان اور قدید کے درمیان ایک چشمہ ہے، تو آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہ نے روزہ افطار کیا"۔ یہ دس ہزار صحابہ مکہ معظمہ پہنچنے پر ہی معلوم کر سکے کہ آپؐ کا کیا ارادہ ہے اور کس طرح جانا ہے۔ حضرت حذیفہ ابن یمان جیسے رازدار صحابی کا بیان ہے کہ مکہ کے پہاڑ کے دامن میں کیمپ لگانے سے پہلے ہمیں بھی معلوم نہیں تھا کہ حضورؐ کہاں جارہے ہیں۔ کبھی شمال، کبھی جنوب، کبھی ادھر، کبھی ادھر، اس طرح جارہے تھے کہ پتا نہیں لگتا تھا۔ مغرب کے وقت وہاں پہنچے اور حکم ہوا کہ ہر شخص اپنا کھانا تیار کرنے کے لیے الگ الگ چولھا جلائے۔ مکہ کا سردار ابوسفیان پہاڑی پر چڑھا تو اسے

خیال ہوا کہ یہ دس ہزار چولھے کم از کم پچاس ہزار کی فوج کے ہوں گے ۔ ابو سفیان گرفتار کر لیا گیا اور مکہ کے چاروں راستے اسلام کی فوج کے قبضہ میں آگئے اور فوج یہ اعلان کرتی ہوئی مکہ میں داخل ہوئی کہ "جو شخص اپنے گھر کے اندر رہے گا وہ امن میں رہے گا، جو شخص ہتھیار ڈال دے گا وہ امن میں رہے گا، جو شخص خانہ کعبہ میں جمع ہو گا وہ بھی امن میں رہے گا اور جو شخص ابو سفیان کے گھر میں جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔" لوگ حیران تھے کہ قریش کا سردار ابو سفیان بھی مسلمان ہو گیا۔

مسلمان خانہ کعبہ میں داخل ہوئے ۔ ظہر کا وقت تھا۔ حضرت بلالؓ نے اذان کہی ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی ۔ پھر مکہ کے لوگوں کو خطاب کیا کہ "تم لوگوں کو مجھ سے اب کیا توقع ہے ؟" یہ چھوٹا سا جملہ تھا، لیکن اس کے پس منظر میں وہی گذشتہ مظالم تھے ۔ وہ لوگ یہی توقع کر رہے تھے کہ قتل کر دیے جائیں گے یا سب کے سب لونڈی غلام بنا لیے جائیں گی ۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ عالم کا یادگار خطبہ ارشاد فرمایا کہ "آج تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ، جاؤ تم سب آزاد ہو "۔ عتاب بن اسید، جو مسلمانوں کا مشہور دشمن تھا، وہ حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ " (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہوں عتاب بن اسید، یعنی آپ کا مشہور دشمن ۔ " اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ " ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی حکمتِ عملی سے مکہ کا گورنر مقرر فرما دیا اور واپسی پر بغیر اپنا کوئی آدمی چھوڑے ہوئے، اسے اس علاقے کا مختار بنا دیا۔ گویا اس کو اعتماد میں لے کر تمام چھپے ہوئے دشمنوں پر اسے مسلط فرما دیا ۔ دوسرے جن دشمنوں کو پناہ ملی ان میں عکرمہ بھی تھا جو ابو جہل کا بیٹا اور باپ کی طرح اسلام کا سخت دشمن ۔ یہ عکرمہ اب حضرت عکرمہؓ ہوئے، حضور کے صحابی اور حدیث کے راوی بھی بنے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ جب مکہ سے مدینہ جا رہی تھیں تو ان کو نیزہ مار کر ہلاک کرنے والا ہبار بھی معاف کر دیا گیا ۔ ابو سفیان کی بیوی ہندہ جس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت امیر حمزہؓ کو قتل کرایا

تھا اور ان کا کلیجہ چبایا تھا، وہ بھی معاف کر دی گئی ۔ حضرت امیر حمزہؓ کا سفاک قاتل وحشی بھی آج معاف کر دیا گیا۔ اوس اور ہوازن کے وہ لوگ جنھوں نے طائف میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے اور لہولہان کیا تھا وہ بھی آج معاف کر دیے گئے ۔ حدیبیہ کے وہ لوگ جو مسلمانوں پر ان کی نماز کے وقت حملہ آور ہوئے تھے وہ بھی آج معاف کر دیے گئے ۔ مکہ کے وہ لوگ جنھوں نے مہاجرین کے مکانوں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا تھا وہ بھی معاف کر دیے گئے، بلکہ وہ تمام مکان اور تمام جائدادیں انھیں کی تحویل میں چھوڑ دی گئیں۔

ابو سفیان کی بیوی ہندہ جس کی معافی کا ذکر ابھی آیا ہے، اس کے مسلمان ہونے کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے ۔ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، لیکن عورتوں کی ایک جماعت کے ساتھ گئی، تاکہ اسے پہچانا نہ جائے ۔ آپؐ نے فرمایا کہ وعدہ کرو کہ تم ایک اللہ کو مانو گی، بت پرستی اور شرک نہیں کرو گی ۔ اس نے باآوازِ بلند کہا، ہم اب تک دھوکے میں تھے ۔ اب ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ ان بتوں میں کوئی طاقت نہیں ہے ۔ ہم ایک اللہ کو مانتے ہیں ۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو چاہیے کہ برا کام نہ کریں ۔ ہندہ فخر سے کہنے لگی کہ کوئی شریف عورت ایسا نہیں کر سکتی ۔ پھر آپؐ نے سب عورتوں سے فرمایا کہ تم آئندہ کسی بچے کو زندہ دفن نہیں کرو گی ۔ ہندہ بے ساختہ کہنے لگی کہ "یا رسول اللہ جن بچوں کو ہم نے پرورش کر کے بڑا کیا، جوان کیا، آپؐ نے ان کو قتل کرا دیا" ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ یہ کون عورت ہے ؟ کہا گیا کہ وہ ہندہ ہے ۔ آپؐ اس سے فرماتے ہیں کہ "اب تم سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی" ۔ اس مختصر جملے سے اس کی اس بات کا بھی رد ہو گیا کہ اس کے بچے قتل ہوئے جب کہ فتح مکہ کے وقت خون کا ایک قطرہ بھی بہایا نہیں گیا۔

وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم)

احکام الہیٰ سے غفلت کی سزا

اللہ پاک کا بے حد احسان ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی فلاح و خیر ہی کے لیے احکام ارشاد فرمائے ہیں اور ان کی ہمہ روز زندگی کے معاملات میں ایسی رہبری فرمائی کہ اس سے امن و امان اور صلح و آشتی بھی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں ان احکام پر عمل کرنے سے اجر اور انعام بھی حاصل ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس ان احکام کی طرف سے غفلت اور بے پروائی برتنے سے دنیا کے معاملات میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور پھر نافرمانی کی وجہ سے آخرت میں سزا بھی ملتی ہے ۔ احکام الہیٰ تو بہت سے ہیں، صرف ارکان اسلام سے غفلت کی وجہ سے جو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے ۔ اس کے متعلق یہاں عرض ہے کہ پہلا رکن ایمان یعنی یہ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں ۔ گویا کفر اور اسلام کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے ۔ اللہ کو معبود نہ جاننا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرنا اس دنیا میں بھی ہزاروں تکلیفوں کا موجب ہے ۔ اس ایک در کو چھوڑ کر ہزاروں دروں پر جھکنا پڑتا ہے اور ہزاروں کی نقالی کرنی پڑتی ہے، پھر بھی سکون نہیں ملتا ۔ وہ قومیں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر دوسروں کو پکڑا ہے ان کو قریب سے دیکھیے اور ان کے دلوں کو ٹٹولیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت اذیت میں ہیں اور شدید کرب میں مبتلا ہیں ۔ پھر آخرت میں ان پر جو عذاب ہوگا وہ بہت سخت ہوگا ۔ سورۃ النحل (آیت ۱۰۶) میں ارشاد ہے کہ

"جو دل کھول کر کافر ہے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بہت بڑا عذاب ہوگا" ۔

اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے اور یہ بھی مسلمان ہونے کی بہت بڑی علامت ہے سورۃ التوبہ (آیت ۵) میں عہد شکن مشرکوں کے لیے ارشاد ہے اور اسی میں نماز جیسی علامت کا ذکر ہے کہ

"پھر جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور قید کرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

یعنی مشرک اگر توبہ کر کے نماز اور زکوٰۃ ادا کرے تو پھر وہ مسلمان ہو جاتا ہے اور پھر اس سے جنگ کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ نماز کے تارک کے متعلق سورہ مریم کے آخر میں (آیت ۵۹) آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد ناخلف لوگوں نے نماز ترک کی اور عذاب کے مستحق ہوئے۔ آیت کا مضمون ہے کہ

"ان (انبیاء علیہم السلام) کے بعد وہ ناخلف آئے جنھوں نے نمازیں گنوائیں اور اپنی خواہشوں کے پیچھے ہوئے تو عنقریب دوزخ میں غی پائیں گے"۔

(غی جہنم کی ایسی سخت گرم وادی ہے جس سے دوزخ بھی پناہ مانگتی ہے۔)

حضرت عبدالرحمن بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"جو شخص اس (نماز) پر محافظت رکھے تو وہ قیامت کے روز اس کے لیے روشنی اور دستاویز اور نجات ہو گی اور جو شخص اس پر محافظت نہ کرے وہ اس کے لیے نہ روشنی ہو گی اور نہ دستاویز اور نہ نجات۔ اور وہ شخص قیامت کے دن قارون اور فرعون اور ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا"۔

نماز کے بعد تیسرا رکن زکوٰۃ ہے اور یہ ایسا رکن ہے جو بار بار صلوٰۃ (نماز) کے ساتھ ہی قرآن پاک میں مذکور ہے۔ یعنی بار بار اس کے لیے تاکید آئی ہے۔ سورۃ النور (آیت ۳۷-۳۸) میں اللہ کے ان نیک بندوں کا ذکر آتا ہے جو کبھی نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں ہوتے۔ ارشاد ہے:

"وہ مرد جنھیں غافل نہیں کرتا کوئی سودا اور نہ کوئی خرید و فروخت، اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے سے، وہ ڈرتے ہیں، اس دن سے جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں، تاکہ اللہ بدلہ دے انھیں ان کے سب سے بہتر کام کا اور اپنے فضل سے انھیں زیادہ انعام دے اور اللہ روزی دیتا ہے، جسے چاہے بے گنتی"۔

صلوٰۃ کی طرح بار بار زکوٰۃ کا حکم اس کی اہمیت کے لیے دلیل ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "زکوۃ اسلام کا پل ہے یا بلند عمارت ہے"۔

یعنی اگر کوئی شخص زکوٰۃ نہ دے تو وہ اسلام پر چل نہیں سکتا اور اسے اسلام کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کوئی شخص سونے کا رکھنے والا اور چاندی کا رکھنے والا ایسا نہیں جو اس کا حق (یعنی زکوٰۃ) نہ دیتا ہو، مگر (اس کا حال یہ ہو گا کہ) جب قیامت کا دن ہو گا اس شخص کے (عذاب کے لیے) اس سونے چاندی کی تختیاں بنائی جائیں گی، پھر ان (تختیوں) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر ان سے اس کی کروٹ اور پیشانی اور پشت کو داغ دیا جائے۔ جب وہ (تختیاں) ٹھنڈی ہونے لگیں گی تو دوبارہ ان کو تپایا جائے گا (اور) یہ اس دن ہو گا جس کی مدت پچاس ہزار برس ہو گی"۔

ایک اور حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، پھر وہ اس کی زکوٰۃ نہ دے (تو) قیامت کے روز وہ مال ایک گنجے سانپ کی شکل بنا دیا جائے گا جس کی دونوں آنکھوں کے اوپر دو نقطے ہوں گے (ایسا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے) اور اس کے گلے میں وہ طوق کی طرح ڈال دیا جائے گا اور وہ اس کی دونوں باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، میں تیری جمع ہوں"۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۰ تلاوت فرمائی کہ

"اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دی، وہ اپنے لیے ہرگز اسے اچھا نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے لیے شر ہے۔ عنقریب وہ چیز جس میں انھوں نے بخل کیا تھا، قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہو گی"۔

زکوٰۃ کے بعد چوتھا رکن صوم (روزہ) ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت ۱۸۳) میں ارشاد ہے کہ

"اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح اگلوں پر فرض ہوئے تھے، تاکہ تمھیں پرہیزگاری ملے"۔

حضرت عمارہ بن حزمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "(علاوہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان لانے کے) اللہ تعالیٰ نے اسلام میں چار چیزیں اور بھی فرض کی ہیں۔ پس جو شخص ان میں سے تین کو ادا کرے تو وہ اس کو کام نہ دیں گی جب تک کہ سب کو ادا نہ کرے (یعنی نماز، زکوٰۃ، اور رمضان کے روزے اور بیت اللہ شریف کا حج)"۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز، زکوٰۃ، حج، سب ادا کرے لیکن روزہ نہ رکھے تو اس کی نجات کے لیے کافی نہیں ۔ روزہ کے بعد پانچواں رکن حج ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہو اور جو منکر ہو تو اللہ سارے جہانوں سے بے پروا ہے"۔

گویا حج بھی احکام خاص میں شامل ہے اور اسلام کا خصوصی رکن ہے جو استطاعت رکھنے والوں کے لیے فرض ہے ۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"جس شخص کو کوئی ظاہری مجبوری یا کوئی ظالم بادشاہ یا کوئی معذور کر دینے والی بیماری حج سے روکنے والی نہ ہو اور پھر وہ بغیر حج کیے مر جائے تو اسے اختیار ہے خواہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر"۔

دیکھیے کس قدر سخت دھمکی ہے اور آخرت میں پھر کتنا عذاب ہے ۔ یہ سزائیں ارکان اسلام سے بے اعتنائی برتنے پر ہیں ۔ یہی حال کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کا بھی ہے بہرحال وہ مسلمان جس کا جینا اور مرنا صرف خدا کے لیے ہو، وہ کس طرح احکام الہیٰ سے غفلت برت سکتا ہے ؟ دعا کرنا چاہیے کہ **ربنا فاغفر لنا ذنوبنا وکفر عنا سیئاتنا وتوفنا مع الابرار ٥**

اسلام اور جدید علوم

اسلام، دنیا اور دنیا والوں کے لیے سراپا رحمت بن کر آیا۔ اس کے آنے سے بے شمار علوم و فنون کے دروازے کھل گئے۔ انسان کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں اور انسان کو معلوم ہوا کہ وہ خلیفتہ اللہ کی حیثیت سے اور اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے کیا کیا کر سکتا ہے؟ خود دین اسلام سے متعلق جتنی جزئیات وجود میں آئی ہیں، پہلے نہیں تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ تفسیر اور اصول تفسیر کسے کہتے ہیں؟ کون جانتا تھا کہ حدیث اور اصول حدیث کیا چیز ہوتی ہے؟ کسے خبر تھی کہ فقہ اور اصول فقہ کیا ہے؟ اور ان کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے؟ علم کلام دنیا کے لیے نئی چیز ثابت ہوئی۔ روایت اور درایت کا تو نام بھی دنیا نے نہیں سنا تھا۔ اسلام سے پہلے کسے معلوم تھا کہ جدید فن تحقیق کی اساس اسی روایت اور درایت پر قائم ہو گی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ phaneties & philology کے بلند آہنگ دعوے تجوید کے ایک چھوٹے سے مسئلہ ادغام کے سامنے ہیچ ہیں۔ یہ علوم صرف ادغام مثلین و متجانسین اور ادغام متقاربین کے گرد گھومتے ہیں۔ اسلام سے پہلے کسے معلوم تھا کہ مسجدوں کے اونچے اونچے مینار اور لمبی لمبی صفیں کس طرح قلب و نظر میں وسعت پیدا کر سکتی ہیں اور حقوق العباد کے ادا کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اسلام نے الوہیت اور وحدانیت کے دلائل سے منطق اور علم کلام کی راہیں کھول دیں۔ قرآن پاک میں جو بار بار **لعلکم تتفکرون** سے فکر کی دعوت دی ہے تو یہی چیز موجودہ فلسفے کی بنیاد بنی۔ وراثت اور عزیزوں کے حقوق کی صحیح تقسیم صرف اسلام نے سکھائی ہے۔ قرآن پاک میں جو

اساطیر الاولین (اگلے لوگوں کے واقعات) بیان ہوئے ہیں، ان سے علم تاریخ کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ قرآن نے جو تحریری یادداشت کا حکم دیا ہے کہ **اذا تداینتم بدین الیٰ اجل مسمی فاکتبوہ** (جب تم آپس میں کسی میعادِ معین کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو)، تو اس حکم کی تعمیل سے ہمارے کتنے باہمی معاملات آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔ سورۃ النور (آیت ۴۳-۴۴) میں ارشاد ہے:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی بادلوں کو چلاتا ہے، پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھر ان کو تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں مینھ نکل کر برس رہا ہے اور آسمانوں میں جو بادلوں کے پہاڑ ہیں ان سے اولے گراتا ہے، تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا رکھتا ہے اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو (خیرہ کر کے بینائی کو) اچکے لیے جاتی ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کو بدلتا رہتا ہے۔ اہل بصارت کے لیے اس میں بڑی عبرت ہے"۔

ان آیتوں سے علم جغرافیہ اور موسمیات کی کتنی بنیادی باتیں آجاتی ہیں۔ سورۃ الرحمن (آیت ۱۷) میں ارشاد ہے:

رب المشرقین و رب المغربین (دو مشرق اور دو مغرب کا رب)

اسلام سے پہلے کسے معلوم تھا کہ دنیا میں دو مشرق اور دو مغرب ہیں۔ امریکہ کے دریافت ہونے سے اور وہ بھی مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے دریافت کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہاں کا مشرق اور مغرب ہمارے مشرق اور مغرب کے سوا ہے۔ سورۃ النحل (آیت ۱۲) میں ارشاد ہے:

"اور اسی (اللہ) نے تمھارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا اور اسی کے حکم سے ستارے بھی کام میں لگے

ہوئے ہیں ۔ سمجھنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں "۔

سورج، اور چاند، دن اور رات کی وجہ سے ہمارے مہینے، ہماری گھڑیاں اور علم نجوم کے متعلقات وجود میں آئے ۔ صرف ایک قطب تارے کی شناخت ہی سے قبلہ کی سمت بھی آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے ۔ سردی اور گرمی کے دن رات کی تعین سے کہ ہمیشہ ایک موسم میں مقررہ وقت پر نمودار ہوتے ہیں ۔ کتنی تقویم اور کیلنڈر بن گئے! سورۃ النحل (آیت ۱۳) میں یہ بھی ارشاد ہے کہ

"اور جو طرح طرح کے رنگوں کی چیزیں اس (اللہ) نے زمین میں پیدا کیں (سب تمھارے زیر فرمان کر دیں) نصیحت پکڑنے والوں کے لیے اس میں نشانی ہے"۔

پھر نصیحت پکڑنے والوں اور غور و فکر کرنے والوں نے مختلف الوان (رنگوں) سے chromopathy یعنی رنگوں سے علاج شروع کیا جو بہت کامیاب رہا ہے ۔ سورہ۔ صٓ (آیت ۴۱-۴۲) میں ارشاد ہے:

اور ہمارے بندے ایوبؑ کو یاد کرو، جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ (اے اللہ) شیطان نے مجھے اذیت اور تکلیف دے رکھی ہے، (تو ہم نے کہا کہ) زمین پر لات مارو (دیکھو) چشمہ نکل آیا، نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کے لیے"۔

اسی آیت مبارکہ کے اشارے سے اٹلی کے louis kohini نے ٹھنڈے پانی کا علاج hydropathy شروع کیا۔ سورۃ الزمر (آیت ۶) میں ارشاد ہے:

"وہی تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں (پہلے) ایک طرح، پھر دوسری طرح تین اندھیروں میں بناتا ہے"۔

اسی ارشاد کے مطابق اور اسی کی روشنی سے maternity science (زچگی کے فن) نے ہدایت حاصل کی ہے ۔ اسی سائنس کے متعلق سورۃ الطارق کی

آیت نمبر۷ میں بھی ارشاد آیا ہے۔ سورہ۔ یسٓ (آیت ۳۶) میں ارشاد ہے:

"وہ خدا پاک ہے جس نے نباتات کے اور خود ان کے اور جن چیزوں کی ان کو خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے"۔

یعنی انسان اور شجر حجر سب کے جوڑے اللہ پاک نے بنائے ہیں۔ نباتات کے جوڑے کے متعلق جرمنی کے سائنس دان Rudolph Jacob Camerariles نے ۱۶۱۱ء اور ۱۶۱۴ء کے درمیان تحقیق کی تو دنیا میں اس کا شہرہ ہو گیا۔ حالاں کہ اس کے وجود سے صدیوں پہلے قرآن پاک نے نباتات بلکہ تمام مخلوقات کے جوڑے کے متعلق بالکل واضح الفاظ میں بتادیا تھا۔ سورۃ الرعد (آیت ۴) میں ارشاد ہے:

وفی الارض قطع متجٰورات (اور زمین میں کئی طرح کے قطعات ہیں)

ان قطعات کے متعلق جدید geology والے حضرات ابھی تک تحقیق میں لگے ہوئے ہیں۔ تیل اور گیس وغیرہ کے ذخائر بھی اسی علم کی بدولت دریافت ہوئے ہیں۔ سورۃ الجاثیہ (آیت ۱۳) میں ارشاد ہے:

وسخر لکم مافی السمٰوٰت ومافی الارض جمیعاً منہ۔ ان فی ذالک لاٰیٰت لقوم یتفکرونo (اور تمھارے لیے مسخر کر دیا جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کا سب کچھ۔ اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور کرتے ہیں۔)

یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، اس پر قبضہ کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔ اب انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور چاند، سورج، مریخ وغیرہ تک پہنچے یا فضا کی تمام فطری قوتوں اور توانائیوں کو استعمال کر کے سرفراز ہو جائے۔ مسلمان فضلاء میں ہسپانیہ کے عباس (المتوفی ۸۸۰ء) نے ہوا میں اڑنے کا سب سے پہلا تجربہ کیا تھا۔ ابن الہیثم نے دسویں

صدی عیسوی میں سب سے پہلے آنکھ کے علاج پر تحقیق کی تھی اور علی ابن ابی الحزم نے سولھویں صدی عیسوی میں دل کا مکمل تجزیہ اور شافی علاج شروع کیا تھا۔ کندی، خوارزمی، حرانی، محمد بن جریر، جریر بن سنان، ابو بکر رازی، فارابی، ابن سینا وغیرہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر دنیا کو فائدہ پہنچا رہے تھے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

قرآنی تراجم و تفاسیر

قرآن پاک جب عرب سے عجم پہنچا تو یہاں کے لوگوں کی آسانی کے لیے اس کے تراجم و تفاسیر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چناں چہ منصور بن نوح سامانی (۳۶۵ھ تا ۳۵۰ھ) کے عہد میں علما نے مل کر پہلا فارسی ترجمہ (مع تفسیر) کیا۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہمارے ملک میں شیخ سعدی سے منسوب فارسی ترجمہ دراصل میر سید شریف جرجانیؒ (م ۸۱۹ھ) کا ہے۔ پھر مخدوم نوح ہالائیؒ (م ۹۹۸ھ) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے ترجمے ہیں۔ اور اردو میں شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ نے ۱۲۰۳ھ میں اور دوسرے صاحبزادے شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۲۰۵ھ میں اپنے ترجمے مرتب کیے۔ شاہ رفیع الدینؒ نے نہایت احتیاط سے لفظ بہ لفظ (بغیر کسی تبدیلی کے) ترجمہ کیا ہے اور اردو محاورے کی پروا نہیں کی۔ مثلاً سورۃ الانعام (آیت ۱۳۱) کی آیتوں کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

"اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی، کیا نہ آئے تھے پاس تمھارے پیغمبر تمھیں میں سے، بیان کرتے تھے اوپر تمھارے، نشانیاں میری، اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمھاری کی ہے"۔

شاہ عبدالقادرؒ اپنا ترجمہ اور تفسیر اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"شروع اس کتاب کا اللہ صاحب کے نام سے ہے جو اللہ صاحب بہت مہربان، مہربانی کرنے والا ہے۔ سب تعریفیں اور

برائیاں خاصی سے خاصی اور ستھری سے ستھری، اول سے آخر تک جو
ہوئی ہیں تمام خدائے تعالیٰ کو لائق ہیں جو پیدا کرنے والا اور پالنے والا
سب طرح کی، ساری خلقت کا ہے"۔

ان ترجموں اور تفسیروں کے بعد اب تک اردو میں قریب سات سو ترجے اور تفسرین شائع ہو چکی ہیں، جن کی مکمل فہرست پیش کرنا بھی یہاں مشکل ہے۔ کچھ ترجے یہ ہیں:

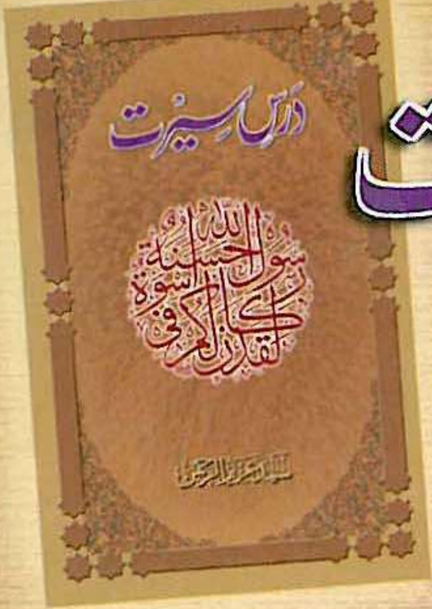
انگریزی کی آمد کے بعد ایک مرتد امام الدین نے اور ایک امریکی پادری پرسیاترین نے ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں قرآن پاک کے اردو ترجے مرتب کیے۔ ان کے بعد کے بعض ترجے برٹش میوزم لندن میں محفوظ ہیں، لیکن ان کے مترجمین کے نام معلوم نہیں۔ ۱۳۰۰ھ میں کنھیا لال الکمداری نے لدھیانہ سے ترجمہ شائع کیا۔ ۱۳۰۴ھ میں سید علی محمد نے کانپور سے (بلامتن) ترجمہ شائع کیا۔ پھر ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے بامحاورہ ترجمہ کیا جو ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوا۔ انھوں نے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی تفسیر موضح قرآن سے جا بجا مدد لی ہے اور خود ڈپٹی صاحب کے ترجے سے بعد کے بزرگوں نے استفادہ کیا ہے۔ ان کی زبان کا نمونہ یہ ہے (سورۃ البقرہ کی آخری آیت کا ترجمہ ہے):

"اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو
ہم کو (اس کے وبال میں) نہ پکڑ اور اے ہمارے پروردگار! جو لوگ ہم
سے پہلے ہو گزرے ہیں، جس طرح ان پر تو نے (ان کے گناہوں کی
پاداش میں احکام سخت کا) بار ڈالا تھا ویسا بار ہم پر نہ ڈال۔ اور اے
ہمارے پروردگار! اتنا بوجھ جس (کے اٹھانے) کی ہم کو طاقت نہیں،
ہم سے نہ اٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگذر اور ہمارے گناہوں
کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا (حامی و) مددگار ہے تو ان
لوگوں کے مقابلے میں جو کافر ہیں ہماری مدد کر"۔

ڈپٹی نذیر احمد کی یہ بامحاورہ زبان شاہ عبدالقادرؒ کی بامحاورہ زبان کے مقابلے میں آج سے بہت قریب ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد ۱۳۲۶ھ میں فرمان علی اثنا عشری کا ترجمہ شائع ہوا۔ اسی زمانے میں سرسید اپنی تفسیر اور ان کے رد میں مولانا عبدالحق حقانی اپنی تفسیر لکھ رہے تھے۔ مولانا فتح محمد جالندھری اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے ترجمے بھی اسی زمانے میں شائع ہوئے۔ ۱۳۲۲ھ میں نظام الدین حسن کا ترجمہ اور دوسرے سال وحید الزمان کا ترجمہ شائع ہوا۔ ۱۳۲۵ھ میں عبداللہ چکڑالوی کا ترجمہ شائع ہوا اور سید احمد حسن اور مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ترجمہ اور تفسیر دونوں شامل کر کے شائع کیے۔ ۱۳۲۷ھ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ شائع ہوا۔ اور دوسرے سال نور الدین قادیانی کا ترجمہ آگرہ سے شائع ہوا۔ ۱۳۳۰ھ میں مولانا احمد رضا خانؒ اور مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ شائع ہوا۔ پھر نواب وحید الزمان کا ترجمہ ۱۳۳۸ھ میں اور مولانا محمود حسن کا ترجمہ ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوا۔ اسی سال محمد علی لاہوری کا ترجمہ مع تفسیر شائع ہوا۔ دوسرے سال خواجہ حسن نظامی کا ترجمہ شائع ہوا۔ اور ۱۳۴۶ھ میں حبیب احمد کیرانوی کا ترجمہ مع تفسیر شائع ہوا۔ ۱۳۵۴ھ میں بشیر الدین محمود کا اور ۱۳۵۵ھ میں راحت حسین گوپال پوری کا ترجمہ شائع ہوا۔ اسی سال مولانا آزاد نے اپنا ترجمہ مرتب کیا اور ۱۳۶۱ھ میں مفتی مظہر اللہ دہلوی نے شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمے کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ ۱۳۶۶ھ میں مولانا محمد اشرف کچھوچھوی کا جزوی ترجمہ شائع ہوا۔ ۱۳۶۸ھ میں عبدالرحیم عرشی نے نصف قرآن کا منظوم ترجمہ کیا۔ دو سال کے بعد عبدالدائم جلالی اور فیروز الدین روحی کے ترجمے شائع ہوئے۔ ۱۳۷۱ھ میں مولانا احمد سعید دہلوی کا ترجمہ شائع ہوا۔ ۱۳۷۴ھ میں مولانا مودودی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے ترجمے مع تفسیر شائع ہوئے۔ ۱۳۸۱ھ میں غلام احمد پرویز کا ترجمہ مفہوم قرآن شائع ہوا اور ۱۳۸۶ھ میں محمد اویس کا منظوم ترجمہ کراچی سے شائع ہوا۔

یہ تو ترجمے تھے۔ تفسیریں بھی اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں نواب واجد علی شاہ نے کلکتہ کے زمانہ۔ اسیری میں صحیفۂ سلطانی ایک جزوی تفسیر شروع کی تھی۔ اسی زمانے میں غلام محمد مہدی نے تفسیر لکھی۔ ۱۲۸۰ھ میں محمد مرتضیٰ الہ آبادی نے سورہ۔ یوسف کی منظوم تفسیر شائع کی۔ پھر دو سال کے بعد انھوں نے تفسیر مظہر العجائب مکمل نثری تفسیر شائع کی۔ ۱۲۸۳ھ میں مولانا قطب الدین دہلوی کی جامع التفاسیر شائع ہوئی۔ ۱۲۸۷ھ میں صبغت اللہ مدراسی کی تفسیر فیض الکریم (ابتدائی ۶ پاروں کی) شائع ہوئی۔ دوسرے سال سید عمار علی سونی پتی کی تفسیر عمدۃ البیان شائع ہوئی۔ ۱۲۹۷ھ میں فخر الدین لکھنوی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی تفسیر حسینی کا اردو ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں نواب صدیق حسن خان نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن پندرہ جلدوں میں مکمل کی۔ پھر محمد عثمان سلیم الدین کی تشریح القرآن، زین العابدین کی کاشف الغم، سید محمد امروہوی کی غایۃ البرہان، عبدالحکیم کی جواہر التفسیر، ابواحمد محمد عبداللہ کی البیان الفصاحتہ القرآن، مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر ثنائی آٹھ جلدوں میں، خلیل احمد اسرائیلی کی تفسیر جو امام رازی کی تفسیر کا ترجمہ ہے، عبدالمجید دہلوی کی تیسیر البیان، ڈاکٹر عبدالحکیم کی تفسیر القرآن بالقرآن، مولوی انشاء اللہ کی تفسیر القرآن آٹھ جلدوں میں، قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری جو بعد میں مولانا عبدالدائم جلالی نے مکمل ترجمے کے ساتھ شائع کی وہ اسی زمانے میں ترجمہ کی جانے لگی تھی۔ حکیم احمد علی کی اسرار القرآن، محمد سعید قادری کی تفسیر واضح القران، ظہور الدین اکمل کی معارف القرآن، امیر علی کی مواہب الرحمن، محمد اشرف علی شمسی کی تفسیر لوامع البیان، عبدالرحمن بخاری کی تفسیر سعیدی، محمد یحییٰ کاندھلوی کی الکوکب الدری، احمد الدین امرتسری کی تفسیر بیان الناس، محمد ابراہیم جوناگڑھی کی تفسیر محمدی، غلام اللہ خاں کی تفسیر جواہر القرآن، مفتی احمد یار خان کی تفسیر نعیمی، احمد حسن فاضل کی تفسیر جدید، پیر کرم شاہ کی ضیاء القرآن، مفتی اعجاز ولی خان کی تنویر



درسِ سیرت

سید عزیز الرحمٰن

پیش لفظ: ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری

مقدمہ: مولانا زاہد الراشدی

- سیرت طیبہ کا مطالعہ دعوتی اور تبلیغی نقطہ نظر سے
- عمل کی دعوت دینے والی خوبصورت تحریر
- سیرت طیبہ کے دعوتی پہلو پر پچاس مختلف موضوعات کے تحت ایک قیمتی مطالعہ
- سادہ اور عام فہم مگر منفرد اسلوب میں

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے-۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی ۱۸- پوسٹ کوڈ ۷۴۶۰۰- فون: ۶۶۸۴۷۹۰

www.zawwaracademy.org

زوار اکیڈمی پبلیکیشنز